ولقد یسرنا القرآن للذکر

آسان درسِ قرآن

(جزء: ۳)

سورۃ الکوثر تا سورۃ القارعۃ

از

حضرت اقدس مولانا مفتی احمد صاحب خانپوری دامت برکاتہم

(بمقام: مسجد انوار، نشاط سوسائٹی، سورت)

ناشر

دارالحمد ریسرچ انسٹیٹیوٹ

سوداگرواڑہ، سورت، گجرات (انڈیا)

ولقد یسّرنا القرآن للذکر

آسان درسِ قرآن (جزء:۳)

(سورۂ کوثر، ماعون، قریش، فیل، ہُمزہ، عصر، تکاثر، قارعۃ)

از

حضرت اقدس مولانا مفتی احمد صاحب خانپوری دامت برکاتہم العالیۃ

(بمقام: مسجد انوار، نشاط سوسائٹی، اڈاجن پاٹیا، سورت)

ناشر

دارالحمد ریسرچ انسٹیٹیوٹ

سوداگرواڑہ، سورت، گجرات۔ (الھند)

تفصیلات

کتاب کا نام :..........................آسان درس قرآن (جزء:۳)

افادات:.............حضرت اقدس مفتی احمد خانپوری صاحب دامت برکاتہم العالیة

تخریج :...عبدالاحد فلاحی

سن طباعت :.....................جمادی الاولیٰ ۱۴۴۰ھ مطابق فروری ۲۰۱۹ء

PUBLISHERS:

DARUL HAMD RESEARCH INSTITUTE

SODAGARWADA, SURAT

+91 9173103824

+91 9537860749

darulhamd2017@gmail.com

ملنے کا پتہ:

دارالحمد ریسرچ انسٹیٹیوٹ، سوداگرواڑہ، سورت۔

فہرست مضامین

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

سورۂ کوثر

(مؤرخہ: ۲۸/ذی الحجہ/ ۱۴۳۹ھ مطابق ۸/ستمبر/ ۲۰۱۸ء شب یک شنبہ)

الحمد لله نحمده ونستعينه ونستغفره ونؤمن به ونتوكل عليه ونعوذ بالله من شرور أنفسنا ومن سيئات أعمالناونعوذبالله من شرورأنفسنا ومن سيئات أعمالنا من يهده الله فلامضل له ومن يضلله فلا هادي له ونشهد أن لا إلٰه إلا الله وحده لا شريك له ونشهد أن سيدنا و مولانا محمداً عبده ورسوله أرسله إلى كافة الناس بشيراً ونذيراً وداعياً إلى الله بإذنه وسراجاً منيراً صلى الله تعالى عليه وعلى اٰله وأصحابه وبارك وسلم تسليماً كثيراً كثيراً .

أمابعد! فأعوذبالله من الشيطٰن الرجيم ۝ بسم الله الرحمٰن الرحيم ۝

اِنَّاۤ اَعۡطَیۡنٰکَ الۡکَوۡثَرَ ؕ﴿۱﴾ فَصَلِّ لِرَبِّکَ وَانۡحَرۡ ؕ﴿۲﴾ اِنَّ شَانِئَکَ ہُوَ الۡاَبۡتَرُ ﴿۳﴾

مکی یا مدنی......؟

یہ سورۂ کوثر ہے، مکہ مکرمہ میں نازل ہوئی۔ یہ سورت مکی ہے یا مدنی؟ اس سلسلے میں دونوں باتیں کہی گئی ہیں۔ حضرت عائشہؓ، حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور جمہور سے منقول ہے کہ مکہ مکرمہ میں نازل ہوئی۔ اور مسلم شریف میں حضرت انسؓ کی روایت سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ مدینہ منورہ میں نازل ہوئی؛[1] لیکن عام طور پر حضرات مفسرین اس کو مکی ہی شمار

---

(۱) صحیح مسلم: ۵۳[۴۰۰].

کرتے ہیں۔ اور حضرت انسؓ کی روایت کے متعلق بتلایا جاتا ہے کہ جب حضور ﷺ کے صاحب زادے حضرت ابراہیمؓ جو مدینہ منورہ میں پیدا ہوئے تھے، اور وہیں اُن کا انتقال ہوا، اس موقع پر بھی کافروں اور منافقوں نے خوشیاں منائی تھیں، ہوسکتا ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ کی طرف سے اس موقع پر اس کو دوسری مرتبہ نازل کیا گیا ہو۔[۱]

شانِ نزول:

اس سورت کے شان نزول کے متعلق بتلایا جاتا ہے کہ جب نبیٔ کریم ﷺ کے صاحب زادے کا انتقال ہوا، تو اس وقت کافروں نے بطورِ خاص عاص بن وائل نے بڑی خوشیاں منائیں۔ حضور اکرم ﷺ کی سب اولاد، سوائے حضرت ابراہیمؓ کے، حضرت خدیجہؓ سے تھیں۔ آپ ﷺ کی چار صاحب زادیوں نے تو بڑی عمر پائی، اور ایمان بھی لائیں۔ البتہ آپ ﷺ کے صاحب زادے بچپن ہی میں انتقال کر گئے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ کی حکمت و مشیت کا یہی تقاضا تھا، چوں کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے حضور اکرم ﷺ کو خاتم النبیین بنایا تھا، اور عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ نبی کی اولاد بھی نبی ہوتی ہے، ان کو بھی پیغمبری سے نوازا جاتا ہے، اور ماننے والوں میں ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جو غلو کے شکار ہوتے ہیں، وہ ان کے بڑے ہونے کے بعد ان کو کوئی مسئلہ نہ بنا لیں، اس لیے اللہ تبارک و تعالیٰ نے آپ ﷺ کی نرینہ اولاد کو بچپن ہی میں اٹھالیا۔

---

(۱) حضرت حسن، عکرمہ، مجاہد اور قتادہ اس کے مدنی ہونے کے قائل ہیں، جیسا کہ زادالمسیر میں ابن جوزی نے صراحت کی ہے۔ نیز سہیلی وغیرہ نے اسے نقل کیا ہے۔

(۱) حضرت زینبؓ:

آپ ﷺ کی صاحب زادیاں چار تھیں۔ سب سے بڑی صاحب زدای حضرت زینبؓ ہیں۔ جب نبی کریم ﷺ کا نکاح حضرت خدیجہؓ سے ہوا، اس وقت حضور اکرم ﷺ کی عمر شریف پچیس سال تھی، نکاح کے پانچ سال بعد حضرت زینبؓ پیدا ہوئیں، یہ صاحب زادیوں میں سب سے بڑی ہیں۔ اس وقت نبی کریم ﷺ کی عمر شریف تیس سال کی تھی۔

(۲) حضرت رقیہؓ:

اوران کے تین سال بعد حضرت رقیہؓ پیدا ہوئیں۔ اس وقت حضور اکرم ﷺ کی عمر شریف تینتیس سال تھی۔ حضرت زینبؓ کا نکاح ان کے خالہ زاد بھائی حضرت ابو العاص بن ربیع -حضرت خدیجہؓ کے بھانجے- سے ہوا تھا۔ بعد میں وہ بھی ایمان لائے اور حضرت زینبؓ جب ہجرت کے لیے روانہ ہوئیں، تو بعض مشرکین نے پیچھا کیا، اور آپؓ کے ہودج پر برچھا لگایا، اس سے آپؓ نیچے پتھر پر گریں، حمل سے تھیں، اسی وقت سے بیمار ہوئیں، اور اسی بیماری میں آپؓ کا انتقال ہوا۔ حضرت شیخؒ نے حکایات صحابہؓ میں پورا قصہ تفصیل سے ذکر کیا ہے، وہاں دیکھا جاسکتا ہے۔ سنہ ۸ھ میں ان کا انتقال ہوا۔

(۳) حضرت ام کلثومؓ:

دوسری صاحب زادی حضرت رقیہؓ اور تیسری صاحب زادی حضرت ام کلثومؓ دونوں کا نکاح حضور ﷺ نے پہلے ابولہب کے دونوں بیٹوں سے کرایا تھا، بڑا بیٹا عتبہ، اور چھوٹا بیٹا عتیبہ تھا۔ حضرت رقیہؓ کا نکاح عتبہ سے کرایا تھا، اور حضرت ام کلثومؓ کا نکاح عتیبہ

سے کرایا تھا۔ رخصتی ہونے سے قبل ہی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعوتِ اسلام کا سلسلہ شروع ہوا، اور ابولہب نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مخالفت شروع کی، اس موقع پر سورۂ لہب نازل ہوئی۔ یہ پورا قصہ آپ سن چکے ہیں۔ اس وقت ابولہب نے اپنے بیٹوں سے کہا تھا: اگر تم ان (حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی بیٹیوں کو طلاق نہیں دو گے تو میرا تمہارے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ چناں چہ اس کے دونوں بیٹوں نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دونوں صاحب زادیوں کو طلاق دے دی۔ یہ قصہ بھی سورۂ لہب کے ضمن میں آپ کو بتلایا گیا ہے۔ اس وقت اِن دونوں کی رخصتی نہیں ہوئی تھی۔

تین ہجرتوں کی سعادت:

پھر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت رقیہؓ -دوسرے نمبر کی صاحب زادی- کا نکاح حضرت عثمانؓ سے کیا۔ وہ بھی ایمان لائے تھے۔ اور جب مسلمانوں نے مکہ والوں کے مظالم سے تنگ آکر حبشہ کی ہجرت کی، تو اُن ہجرت کرنے والوں میں یہ جوڑا -حضرت عثمانؓ، اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صاحب زادی حضرت رقیہؓ- بھی تھا۔ پھر حبشہ میں کسی نے افواہ چلا دی کہ مکہ والے سب ایمان لے آئے، تو جو لوگ ہجرت کر کے حبشہ گئے تھے وہ یہ سوچ کر کہ ہم تو ان کی ایذاؤں کی وجہ سے یہاں آئے ہوئے تھے، اب وہ سب ایمان لے آئے ہیں، تو ہم واپس چلے جائیں۔ لیکن جب واپس آئے، تو معلوم ہوا کہ یہ خبر تو جھوٹی تھی، تو دوبارہ ہجرت کی۔ حبشہ کی دونوں ہجرتیں حضرت رقیہؓ نے اپنے شوہر حضرت عثمانؓ کے ساتھ کی ہیں۔ پھر وہاں سے وہ مدینہ بھی پہنچے۔ گویا تین ہجرتیں ہوئیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب غزوۂ بدر کے لیے نکلے تو اس وقت حضرت رقیہؓ بیمار تھیں، اور حضرت عثمانؓ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ غزوۂ بدر میں شرکت کرنا چاہتے تھے۔ لیکن نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

نے ان کو روک دیا، اور تاکید فرمائی کہ تم ان کی خبر گیری میں رہو۔ چناں چہ اسی دوران اللہ تعالیٰ نے غزوۂ بدر میں مسلمانوں کو کامیابی عطا فرمائی اور اس کی خوش خبری لے کر جب آدمی مدینہ منورہ پہنچا، تو اُس نے دیکھا کہ لوگ حضرت رقیہ ؓ کو دفن کر کے فارغ ہوئے ہیں۔ ان کا انتقال سنہ ۳ ھ میں ہوا۔

ذوالنورین:

اس کے بعد اللہ تعالیٰ ہی کے حکم سے حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے دوسری صاحب زادی حضرت ام کلثوم ؓ کو بھی حضرت عثمان ؓ کے نکاح میں دیا، یہ کہہ کر کہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے میں ان کے نکاح میں دے رہا ہوں۔ اسی لیے حضرت عثمان ؓ کا لقب ذوالنورین تھا دونور والے۔ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی دو صاحب زادیاں ان کے نکاح میں تھیں، اس لیے ان کو ذوالنورین کہا جاتا تھا۔ حضرت ام کلثوم ؓ کا انتقال سنہ ۹ ھ میں ہوا۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ان کی تدفین میں شریک رہے ہیں۔

(۴) حضرت فاطمہ ؓ:

اور چوتھی صاحب زادی حضرت فاطمہ ؓ۔ نبوت کے ایک سال بعد پیدا ہوئیں۔ گویا آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر وحی کا سلسلہ شروع ہوا، اس کے بعد ان کی پیدائش ہوئی۔ حضرت فاطمہ ؓ کا نکاح حضرت علی ؓ سے ہوا، اور پھر ان ہی سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی اولاد چلی۔ آج تک سادات کا سلسلہ ان ہی سے ہے۔ یہ تو صاحب زادیاں ہیں۔

(۱) حضرت قاسم ؓ:

اور صاحب زادوں میں نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے بڑے صاحب زادے حضرت قاسم ؓ

حضرت زینبؓ سے پہلے پیدا ہوئے، یا بعد میں؟ اس سلسلے میں مؤرخین میں اختلاف ہے بعض حضرات فرماتے ہیں: پہلے حضرت زینبؓ، پھر حضرت قاسم پیدا ہوئے۔ بعض حضرات کا قول اس کے برعکس ہے۔ بہرحال! دوسال کی عمر میں حضرت قاسمؓ کا انتقال ہوگیا تھا۔

(۲) حضرت عبداللہؓ:

دوسرے صاحب زادے حضرت عبداللہؓ نبوت کے بعد پیدا ہوئے۔ اور ان کی پیدائش کے بعد ان کے علاوہ صاحب زادوں میں ایک حضرت ابراہیمؓ ہیں، جو مدینہ منورہ میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی باندی حضرت ماریہ قبطیہؓ سے پیدا ہوئے تھے۔ ان تین صاحب زادوں کے متعلق سب کا اتفاق ہے۔ ان کے علاوہ کے سلسلے میں بعض کہتے ہیں کہ طیب بھی تھے، طاہر بھی تھے۔ یعنی کل ملا کر پانچ تھے۔ بعض کہتے ہیں کہ طیب اور طاہر ایک ہی صاحب زادے کا لقب تھا۔ تو کل چار ہوئے۔ بعضوں نے کہا کہ طیب اور طاہر حضرت عبداللہ جو نبوت کے بعد پیدا ہوئے تھے، نبوت کے بعد پیدا ہونے کی وجہ سے ان ہی کے لقب تھے۔ اور اسی کو حضرات مؤرخین نے راجح قرار دیا ہے۔

جب کوئی نرینہ اولاد باقی نہ رہی:

حضرت عبداللہؓ بچپن ہی میں انتقال کر گئے، اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی کوئی نرینہ اولاد باقی نہ رہی۔ اس وقت مکہ کے مشرکین نے جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے دشمن تھے اور ان میں خاص طور پر عاص بن وائل، اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا چچا ابولہب، ان لوگوں نے خوشیاں منائیں۔ اور یوں کہا کہ اب ان کی تو کوئی نرینہ اولاد نہ رہی۔ اور عرب لوگ جس کی نرینہ اولاد ختم ہو

جاتی / نہ ہوتی، اس کو ابتر کہتے تھے۔ گویا ان کے دنیا سے جانے کے بعد دنیا میں ان کا نام لینے والا کوئی باقی نہیں رہے گا۔ اولاد ہی سے آدمی کا سلسلہ چلتا ہے، اور جب وہ ختم ہوگئی تو یہ بے نام ونشان ہوگیا۔ اس پر عاص بن وائل نے کہا تھا کہ یہ ابتر ہیں۔ اور اسی پر اللہ تبارک و تعالیٰ نے بشارت سناتے ہوئے یہ سورت نازل فرمائی۔[۱]

سب سے چھوٹی سورت:

کلمات اور حروف کے اعتبار سے قرآن کی سورتوں میں یہ سب سے چھوٹی سورت ہے۔ کلمات ۱۴/ بتلائے گئے ہیں، اور حروف ۴۲/ ہیں۔ گویا تمام سورتوں میں یہ سب سے چھوٹی سورت کہلاتی ہے۔

اس سورت میں آپ ﷺ کو دو خوش خبریاں دی گئی ہیں، اور دو حکم دیے گئے ہیں۔ پہلی خوش خبری تو یہ دی گئی: اِنَّآ اَعۡطَیۡنٰکَ الۡکَوۡثَرَ (اے نبی! یقین جانو! ہم نے آپ کو کوثر عطا کر دی ہے)۔

کوثر کیا ہے؟

کوثر کیا ہے؟ یہ کلمہ کثرة سے بنا ہے۔ لغت اور ڈکشنری کے اعتبار سے کوثر خیر کثیر کو کہتے ہیں، یعنی بہت زیادہ بھلائی۔[۲] اللہ تبارک وتعالیٰ نے نبیٔ اکرم ﷺ کو دنیوی، اخروی، مادی اور روحانی بہت ساری بھلائیوں سے نوازا تھا۔ آپ ﷺ کو نبوت عطا فرمائی، قرآن

(۱) حضرت حسن، عکرمہ، مجاہد اور قتادہ اس کے مدنی ہونے کے قائل ہیں، جیسا کہ زاد المسیر میں ابن جوزی نے صراحت کی ہے۔ نیز سہیلی وغیرہ نے اسے نقل کیا ہے۔

(۲) كتاب العين للفراهيدي: ۳۴۸/۵ (ط: مكتبة الهلال)

عطا فرمایا، آپ ﷺ کو اتنی بڑی امت دی۔ سب بھلائیاں ہی بھلائیاں ہیں۔ دنیا کی بھی اور آخرت کی بھی۔ گویا ان سب کی طرف اشارہ ہے۔

جنت کی نہر:

اور ان ہی میں سے ایک وہ نہر بھی ہے، جو اللہ تعالیٰ نے جنت میں بنائی ہے، جس کا نام نہر کوثر ہے۔ اور ان ہی میں سے وہ حوض بھی ہے جو میدان حشر میں ہوگا، جو چوکور (ચોરસ) ہوگا۔ کوثر حوض بھی ہے اور نہر بھی ہے۔ نہر تو جنت میں ہے، اور اسی نہر سے دو پرنالے-ایک چاندی کا اور ایک سونے کا - میدان حشر میں اس حوض میں پانی ڈالنے کے لیے لائے گئے ہیں۔ اور ان سے پانی اس حوض میں گرتا رہتا ہے۔ اور وہ پانی اسی نہر سے پہنچتا رہتا ہے۔ اس حوض کا نام بھی حوض کوثر ہے۔ جب محشر میں لوگ دوبارہ زندہ کر کے پہنچائے جائیں گے تو پیاسے ہوں گے، اس وقت نبی کریم ﷺ اپنی امت کے لوگوں کو اسی میں سے پانی پلائیں گے۔ تو یہ کوثر حوض بھی ہے، اور اس حوض میں پانی جنت کی جس نہر سے آتا ہے اس نہر کا نام بھی نہر کوثر ہے۔[۱]

اولاد کی زیادتی:

حضرت شاہ عبد العزیز صاحب محدث دہلویؒ تفسیر فتح العزیز (تفسیر عزیزی) میں فرماتے ہیں کہ کوثر سے آپ ﷺ کی اولاد کی زیادتی بھی مراد ہے۔ آپ ﷺ کی اولاد دو طرح کی ہے: حقیقی اور مجازی۔ حقیقی اولاد جو آپ ﷺ کی صاحبزادی حضرت فاطمہؓ کے

(۱) حضرت حسن، عکرمہ، مجاہد اور قتادہ اس کے مدنی ہونے کے قائل ہیں، جیسا کہ زاد المسیر میں ابن جوزی نے صراحت کی ہے۔ نیز سہیلی وغیرہ نے اسے نقل کیا ہے۔

بطن سے پیدا ہوئی، آج دنیا میں دیکھیے! سادات پورے عالم میں بڑی تعداد میں ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کی اولاد کو اتنا کثیر بنایا کہ پورے عالم میں پھیلی ہوئی ہے۔ سادات کا سلسلہ آپ جہاں جہاں جائیں گے، وہاں نظر آئے گا۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اولاد کی اتنی کثرت ہے - جو اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضرت فاطمہؓ کے ذریعہ فرمائی - کہ کسی کی اولاد کی اتنی کثرت نہیں ہے۔ یہ تو حقیقی اولاد ہے جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صاحب زادی سے وجود میں آئی۔

مجازی اولاد:

اور دوسری مجازی اولاد ہے۔ وہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لانے والے تمام اہل ایمان ہیں۔ ان کی تعداد تو اتنی زیادہ ہے کہ قیامت کے روز تمام امتوں میں سب سے زیادہ بڑی امت آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہوگی۔[1]

ترمذی شریف کی روایت ہے کہ میدان حشر میں اہل جنت کی ۱۲۰/ صفیں لگیں گی، ان میں سے ۸۰/ یعنی دو تہائی صفیں امت محمدیہ کی ہوں گی۔[2] اس سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی روحانی اور مجازی اولاد کی کتنی بڑی تعداد ہے!!! اور وہ سب میدان حشر میں حوض کوثر پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دست مبارک سے پانی پیے گی۔ گویا اللہ تعالیٰ نے یہ بشارت سنائی۔

تمام علوم پائے:

شاہ عبدالعزیز صاحبؒ فرماتے ہیں کہ علوم کی کثرت یہ بھی اس کوثر میں آجاتی ہے۔[3]

---

(۱) حضرت حسن، عکرمہ، مجاہد اور قتادہ اس کے مدنی ہونے کے قائل ہیں، جیسا کہ زاد المسیر میں ابن جوزی نے صراحت کی ہے۔ نیز سہیلی وغیرہ نے اسے نقل کیا ہے۔

(۲) سنن الترمذي: ۲۵۴۶.

(۳) تفسیر عزیزی/ ۲۶۰۔

اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس امت کو جتنے علوم عطا فرمائے کسی اور امت کو اتنے علوم نہیں دیے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ اس سے پہلے جتنی بھی امتیں گذری ہیں، ان تمام کے علوم اس امت نے پائے ہیں، اس لیے کہ یہ بعد میں آئی۔ نیز خود اس امت نے بہت سے علوم کی ایجاد کی: نحو، صرف، معانی، بلاغت، تفسیر، حدیث، اصول تفسیر، اصول حدیث، فقہ، اصول فقہ، علم رجال وغیرہ اس امت نے ایجاد کیے ہیں۔ تو اگلوں اور پچھلوں کے سارے علوم اللہ تعالیٰ نے اس امت کو عطا فرمائے۔ اور کوثر کا عرفی معنی نہر یا حوض ہے، وہ بھی اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو عطا فرمایا۔[1]

بہر حال! اس پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کے متعلق جنہوں نے سب باتیں اڑائیں، خوشیاں منائیں اس کی وجہ سے آپ ﷺ کا دل رنجیدہ ہوا تھا، تو اللہ تعالیٰ نے اس خوش خبری کے ذریعے آپ ﷺ کو خوشی عطا فرمائی۔

پہلی خوش خبری:

مسلم شریف میں حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ ہمارے درمیان نبی کریم ﷺ تشریف فرما تھے کہ آپ ﷺ پر ایک غشی کی سی کیفیت طاری ہوئی، جو وحی کے نزول کے وقت طاری ہوتی تھی، جب وہ کیفیت دور ہوئی، تو آپ ﷺ مسکرانے لگے۔ ہم نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول! آپ کیوں مسکراتے ہیں؟ تو جواب میں آپ ﷺ نے فرمایا: ابھی اللہ تعالیٰ نے مجھ پر ایک سورت نازل فرمائی، اور پھر آپ ﷺ نے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

(۱) حضرت حسن، عکرمہ، مجاہد اور قتادہ اس کے مدنی ہونے کے قائل ہیں، جیسا کہ زاد المسیر میں ابن جوزی نے صراحت کی ہے۔ نیز سہیلی وغیرہ نے اسے نقل کیا ہے۔

پڑھ کر پوری سورت سنائی، پھر خود ہی سوال کیا کہ جانتے ہو کوثر کیا ہے؟ اور پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کوثر کی تشریح فرمائی۔[۱] بہر حال! اس سورت کو نازل فرما کر اللہ تبارک وتعالیٰ نے دو خوش خبریاں عطا فرمائی تھیں۔ ان میں سے ایک خوش خبری تو یہ ہے۔

چشم اقوام یہ نظارہ ابد تک دیکھے:

دوسری خوش خبری تیسری آیت میں ہے: اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْاَبْتَرُ. شنأ-يشنأ کا معنی ہے بغض و عداوت رکھنا، دشمنی رکھنا۔ وَ لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا (المائدة:٨) (کسی قوم کی عداوت تم کو اس پر آمادہ نہ کرے کہ تم انصاف کے تقاضوں کو پورا نہ کرو) اسی سے اسم فاعل کا صیغہ ہے شانئ یعنی دشمن، اسی سے کہا: اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْاَبْتَرُ (یقین جانو! تمہارا دشمن ہی ہے وہ جس کی جڑ کٹی ہوئی ہے) ابتر یعنی جس کی دم کٹی ہوئی ہو، جڑ کٹی ہوئی ہو۔ جو بے اولاد ہو اس کو بھی ابتر کہتے ہیں، جس کا اب نام و نشان نہیں۔ وہ آپ کو بے نام و نشان کہتا ہے!!! اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: نہیں! آپ کو تو اللہ تعالیٰ نے بے شمار نعمتیں عطا فرمائی ہیں، یہ آپ کا دشمن ہی بے نام و نشان ہے۔

چناں چہ آج پورے عالم میں کروڑوں کی تعداد میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ماننے والے ہیں، وہ ہر وقت اپنی جان آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عزت و آبرو کے لیے چھڑکنے کے لیے تیار ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر درود شریف پڑھنے کو اپنی سعادت سمجھتے ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زیارت کے لیے مدینہ منورہ حاضری کو اپنی سعادت سمجھتے ہیں، اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی کی نسبت سے اپنی اولاد کے نام احمد یا محمد رکھتے ہیں ان کی تعداد اور کثرت دیکھو۔

---

(۱) حضرت حسن، عکرمہ، مجاہد اور قتادہ اس کے مدنی ہونے کے قائل ہیں، جیسا کہ زاد المسیر میں ابن جوزی نے صراحت کی ہے۔ نیز سہیلی وغیرہ نے اسے نقل کیا ہے۔

چشم اقوام یہ نظارہ ابد تک دیکھے	رفعت شان ورفعنا لک ذکرک دیکھے

(اقبالؔ)

وہی دُم بریدہ ہے:

نیز اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے نام کے ساتھ آپ ﷺ کا نام اذان میں بھی جُڑوایا اور اقامت میں بھی۔ دنیا میں سورج گردش کرتا ہے، تو ہر لمحہ کسی نہ کسی جگہ نئی نماز کا وقت شروع ہوتا ہے۔ ہمارا غروب تو کب سے ہوگیا؛ لیکن اس وقت کسی نہ کسی جگہ سورج غروب ہو رہا ہوگا، اور اس کے بعد مغرب کی اذان ہوگی۔ اِس وقت کہیں عشاء کا وقت شروع ہو رہا ہوگا، کہیں فجر کا وقت شروع ہو رہا ہوگا، کہیں ظہر کا وقت شروع ہو رہا ہوگا، کہیں عصر کا وقت شروع ہو رہا ہوگا۔ گویا پورے عالم میں ہر وقت کہیں نہ کہیں، کسی نہ کسی نماز کا وقت شروع ہو رہا ہے، اور نماز بھی پڑھی جا رہی ہے۔ تو اذان اور اقامت میں اللہ تبارک وتعالیٰ کے نام کے ساتھ آپ ﷺ کا نام بھی لیا جا رہا ہے۔ آپ ﷺ کا نام لینے والے اللہ تعالیٰ نے لاکھوں اور کروڑوں کی تعداد میں پیدا فرمائے۔ تو جو آپ ﷺ کو بے نام ونشان کہتا تھا، آج آپ ﷺ سے زیادہ کسی کا نام لینے والا نہیں ہے۔ اور عاص بن وائل وغیرہ جو آپ ﷺ کو بے نام ونشان کہتے تھے ان کو باری تعالیٰ فرماتے ہیں: وہی ابتر اور دم بریدہ ہے۔ آج اس کا کوئی نام جاننے والا بھی نہیں، اور اگر اس کا نام لیا بھی جاتا ہے تو اس واقعے کی نسبت سے، اور وہ بھی اچھائی کے ساتھ نہیں؛ بلکہ برائی کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ ورنہ نام بھی کون جانتا ہے؟ اور اس کے نام پر نام رکھنے والے آج دنیا میں کتنے ہیں؟ کسی نے بھی اس کے نام پر اپنی اولاد کا نام رکھا؟ تو حقیقت میں وہی بے نام ونشان ہے، اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو بڑی

عزت عطا فرمائی ہے۔

یہ دو خوش خبریاں تھیں، پہلی آیت میں، اور تیسری آیت میں۔ بیچ کی آیت میں اللہ تعالیٰ نے دو حکم بھی دے دیے۔

دو حکم:

فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ

جب اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اتنی بڑی خیر عطا فرمائی ہے تو اے نبی! فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ (تم اپنے پروردگار کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے نماز پڑھو، اور قربانی کرو)۔ نحر اونٹ کے ذبح کرنے کو کہتے ہیں؛ لیکن یہاں مطلق قربانی مراد ہے۔

نمازِ عید و قربانی واجب ہے:

یہاں کون سی نماز مراد ہے؟ تو حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے ایک روایت تو یہ ہے کہ اس سے پانچوں وقت کی فرض نمازیں مراد لی گئی ہیں۔[1] اور حضرت انس رضی اللہ عنہ کی ایک روایت جو علامہ قرطبی رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں ذکر کی ہے، اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس سے عید الاضحیٰ کی نماز مراد لی گئی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ پہلے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا معمول یہ تھا کہ قربانی پہلے کرتے تھے، اور پھر نماز پڑھتے تھے۔ جب یہ آیت نازل ہوئی، تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پہلے عید کی نماز پڑھنے لگے، اور اس کے بعد قربانی کرنے لگے۔[2] تو اس سے معلوم ہوا کہ نماز سے عید

---

(۱) رواه الضحاک عن ابن عباس رضی اللہ عنهما (تفسير القرطبي) ورواه الطبري بسنده عن علي بن أبي طالب رضي الله عنه.

(۲) حضرت حسن، عکرمہ، مجاہد اور قتادہ اس کے مدنی ہونے کے قائل ہیں، جیسا کہ زاد المسیر میں ابن جوزی نے صراحت کی ہے۔ نیز سہیلی وغیرہ نے اسے نقل کیا ہے۔

کی نماز مراد ہے۔ اور فصَلِّ اور وانحر یہ دونوں امر کے صیغے ہیں اسی لیے احناف اس بات کے قائل ہیں کہ عید کی نماز بھی واجب ہے، اور قربانی بھی واجب ہے۔ ان ہی آیتوں کی وجہ سے ان کے وجوب کے قائل ہیں، ان ہی سے وجوب پر استدلال کیا گیا ہے۔

دشمن کی ناکامی کا غیبی نسخہ:

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اگر کوئی آدمی کسی کی مخالفت پر آمادہ ہے، دشمنی پر اترا ہوا ہے، اس کی طرف سے اس کے خلاف اسکیموں کو اگر وہ ناکام ونامراد بنانا چاہے، تو اس کا غیبی نسخہ بھی اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس سورت میں بتلا دیا کہ نماز پڑھو اور قربانی کرو۔ اس کا اہتمام کروگے تو اللہ تعالیٰ آپ کے دشمن کو ناکامی عطا فرمائیں گے۔

اب کوثر کے سلسلے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کچھ ارشادات ہیں، مشکوٰۃ شریف میں صاحب مشکوٰۃ نے کوثر کی مناسبت سے جو روایات ذکر کی ہیں ان ہی کا ترجمہ آپ کے سامنے پیش کیا جاتا ہے۔

چند احادیثِ حوض کوثر:

مشک کے مانند خوشبودار:

(۱) حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: میں شب معراج میں جنت میں چل پھر رہا تھا، اچانک کیا دیکھتا ہوں کہ ایک نہر کی دونوں جانب موتیوں کے بنائے ہوئے ایسے قبے ہیں کہ موتیوں کو اندر سے تراش کر اس نہر پر ایک ایک موتی کا ایک ایک قبہ بنا دیا گیا ہے۔ میں نے دریافت کیا: اے جبریل! یہ کیا ہے؟ انہوں نے جواب دیا

کہ یہ کوثر ہے، جو آپ کے رب نے آپ کو عطا فرمائی ہے، اس کے اندر کی مٹی بہت تیز خوشبودار مشک ہے۔[۱] گویا یہ جنت کی نہر ہے، نہر بھی ہے، اور اسی سے پانی لاکر میدان حشر میں حوض بھی بنایا گیا ہے۔

آسمان کے تارے، کوثر کے پیالے:

(۲) حضرت عبداللہ بن عمروؓ روایت کرتے ہیں کہ آں حضرت، سید عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: میرے حوض کا طول وعرض یعنی لمبائی اور چوڑائی اتنی زیادہ ہے کہ اس کی ایک طرف سے دوسری طرف جانے کے لیے ایک مہینے کی مدت درکار ہے۔ یعنی اُس زمانہ میں جو سفر کے ذرائع تھے، ان کے ذریعے سے ایک مہینے کی مسافت کے بقدر اس کی لمبائی بھی ہے، اور چوڑائی بھی۔ حوض کوثر چوکور ہے، اس کے گوشے برابر ہیں، یعنی طول وعرض دونوں برابر ہیں۔ اس کا پانی دودھ سے زیادہ سفید ہے، اس کی خوشبو مشک سے زیادہ عمدہ ہے، اس کے لوٹے اتنے ہیں جتنے آسمان کے ستارے، جو اس میں سے پیے گا کبھی پیاسا نہ ہوگا۔[۲] جس نے ایک مرتبہ پی لیا تو کبھی اس کو پیاس نہ ستائے گی۔ پھر جنت میں جو پینا وغیرہ ہوگا وہ صرف لذت حاصل کرنے کے لیے ہوگا، پیاس بجھانے کے لیے نہیں۔

ضرور پہچانیں گے:

(۳) حضرت ابوہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: میرا حوض اس قدر لمبا اور چوڑا ہے کہ اس کے دونوں طرفوں کے درمیان اُس فاصلے سے بھی

---

(۱) حضرت حسن، عکرمہ، مجاہد اور قتادہ اس کے مدنی ہونے کے قائل ہیں، جیسا کہ زاد المسیر میں ابن جوزی نے صراحت کی ہے۔ نیز سہیلی وغیرہ نے اسے نقل کیا ہے۔

(۲) رواہ الشیخان: البخاري: ۲۰۹۳ ومسلم: ۴۲۴۴.

زیادہ فاصلہ ہے جو ''ایلہ'' سے ''عدن'' تک ہے۔[۱] (ایلہ فلسطین کے علاقے میں ایک بندرگاہ ہے، اور عدن یمن میں واقع ہے۔ ان دونوں کے درمیان جتنا فاصلہ ہے، حوضِ کوثر کا ایک سِرا دوسرے سِرے سے اتنا دور ہے) سچ جانو! وہ برف سے زیادہ سفید اور اُس شہد سے زیادہ میٹھا ہے جو دودھ میں ملا ہوا ہو، اور اس کے برتن ستاروں کی تعداد سے زیادہ ہیں، اور میں دوسری امتوں کو اپنے حوض پر آنے سے ہٹاؤں گا، جیسے دنیا میں کوئی شخص دوسروں کے اونٹوں کو اپنے حوض سے ہٹاتا ہے۔ صحابہؓ نے عرض کیا: یارسول اللہ! کیا اُس روز ہم کو آپ پہچانتے ہوں گے؟ یعنی ہم آئیں گے تو آپ ہم کو پہچانیں گے؟ تو حضور ﷺ نے فرمایا: ہاں! ضرور پہچانیں گے۔ اس لیے کہ تمہاری ایک علامت ہوگی، وہ کسی اور امت کی نہیں ہوگی، وہ یہ کہ تم حوض پر میرے پاس ایسی حالت میں آؤ گے کہ وضو کے اثر سے تمہارے چہرے روشن ہوں گے، اور ہاتھ پاؤں سفید ہوں گے۔[۲] تو وضو کرو گے اور نمازیں پڑھو گے تب یہ چیز پائی جائیں گی نا!!! اس لیے اس کا بھی اہتمام ہونا چاہیے۔

(۴) مسلم شریف کی دوسری روایت میں یہ بھی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: آسمان کے ستاروں کی تعداد کے برابر حوض میں سونے چاندی کے لوٹے نظر آرہے ہوں گے۔[۳]

دو پرنالے، سونے اور چاندی کے:

(۵) مسلم شریف کے حوالے سے ایک اور روایت کے الفاظ ہیں: آپ ﷺ نے فرمایا: اُس حوض میں دو پرنالے گر رہے ہوں گے جو جنت کی نہر سے اس کے پانی میں

---

(۱) رواہ الشیخان: البخاري: ۲۰۹۳ ومسلم: ۴۲۴۴.

(۲) رواہ الشیخان: البخاري: ۲۰۹۳ ومسلم: ۴۲۴۴.

(۳) رواہ الشیخان: البخاري: ۲۰۹۳ ومسلم: ۴۲۴۴.

اضافہ کررہے ہوں گے۔ایک پرنالہ سونے کا اور دوسرا چاندی کا ہوگا۔یعنی محشر میں جو حوض بنایا جائے گا اس کا پانی جنت کی نہر کوثر سے آئے گا۔[۱]

بہر حال! احادیث شریفہ سے معلوم ہوتا ہے کہ نہر کوثر جنت میں ہے اور میدان حشر میں اس میں سے ایک شاخ لائی جائے گی،جس میں اوپر سے پانی آتا رہے گا،اور ایمان والے اس میں سے پیتے رہیں گے۔

جامِ کوثر کس کے لیے:

(٦) حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی ایک اور روایت ہے کہ نبیٔ کریم ﷺ نے فرمایا: میرا حوض اتنا بڑا ہے کہ جتنا عدن اور عمّان کے درمیان فاصلہ ہے۔(عدن یمن میں ہے، عمان جورڈن میں ہے) برف سے زیادہ ٹھنڈا اور شہد سے زیادہ میٹھا،اور مشک سے بہتر اس کی خوشبو ہے۔اس کے پیالے آسمان کے ستاروں سے بھی زیادہ ہیں، جو اس میں سے ایک مرتبہ بھی پی لے گا اس کے بعد کبھی بھی پیاسا نہ ہوگا۔سب سے پہلے اس پر مہاجرین،فقراء آئیں گے۔کسی نے مجلس میں سے پوچھا: یارسول اللہ! ان مہاجرین،فقراء کا حال بتادیجیے! تو آپ ﷺ نے فرمایا: یہ لوگ وہ ہیں کہ دنیا میں جن کے سروں کے بال بکھرے ہوئے اور چہرے بھوک،محنت اور تھکن کے باعث بدلے ہوئے ہوتے تھے،ان کے لیے بادشاہوں اور حاکموں کے دروازے نہیں کھولے جاتے تھے،اور عمدہ عورتیں ان کے نکاح میں نہیں دی جاتی تھیں۔[۲] اور ان کے معاملات کی خوبی کا حال یہ تھا کہ اُن کے ذمے کسی کا حق ہوتا تھا وہ ادا کردیتے تھے،اور ان کا حق جو کسی کے ذمے ہوتا وہ پورا نہ وصول کرتے تھے؛ بلکہ تھوڑا

---

(۱) صحیح مسلم: [۳۷] ۲۳۰۱.

(۲) رواه الشيخان البخاري: ۲۰۹۳ ومسلم: ۴۲۴۴.

بہت چھوڑ دیتے تھے۔ گویا ان صفات کو اپنے اندر پیدا کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ ہمارا حق کسی پر ہے تو اس کو وصول کرنے میں کچھ چھوڑ دیا جائے، دوسروں کا حق پورا ادا کیا جائے۔

حضرت عمر بن عبد العزیزؒ نے جب یہ حدیث سنی تو کہا کہ میرے نکاح میں تو عبدالملک بن مروان کی بیٹی ہے، اور میرے لیے تو بادشاہوں کے دروازے کھولے جاتے ہیں، تو میں کیسے ان لوگوں میں سے ہوسکوں گا؟ تو پھر انہوں نے یہ اہتمام کیا کہ بال جب تک خشک ہو کر بکھرنے نہ لگتے تھے تب تک وہ تیل استعمال نہیں کرتے تھے؛ تاکہ بکھرے ہوئے بال والی صفت اپنے اندر پائی جائے۔ [١]

اللہ تعالیٰ ہم سب کو یہ نعمت عطا فرمائے، اس کے لیے جن اعمال کا اہتمام کرنا ہے اس کے لیے ہمیں کوشش کرنی چاہیے۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو توفیق اور سعادت عطا فرمائے۔

---

(١) مسند عمر بن عبدالعزیز: ١/١٢٢ [٢٣] (ط: مؤسسة علوم القرآن، دمشق).

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

سورۂ ماعون

(مؤرخہ ۵؍محرم الحرام ۱۴۴۰ھ مطابق ۱۵؍ستمبر ۲۰۱۸ء، شب یک شنبہ)

الحمد لله نحمده ونستعينه ونستغفره ونؤمن به ونتوكل عليه ونعوذ بالله من شرور أنفسنا ومن سيئات أعمالناونعوذبالله من شرورأنفسنا ومن سيئات أعمالنا من يهده الله فلامضل له ومن يضلله فلا هادي له ونشهد أن لا إلٰه إلا الله وحده لا شريك له ونشهد أن سيدنا و مولانا محمداً عبده ورسوله أرسله إلى كافة الناس بشيراً ونذيراً وداعياً إلى الله بإذنه وسراجاً منيراً صلى الله تعالى عليه وعلى آله وأصحابه وبارك وسلم تسليماً كثيراً كثيراً.

أما بعد! فأعوذبالله من الشيطٰن الرجيم ○ بسم الله الرحمٰن الرحيم ○

اَرَءَيۡتَ الَّذِىۡ يُكَذِّبُ بِالدِّيۡنِ ﴿۱﴾ فَذٰلِكَ الَّذِىۡ يَدُعُّ الۡيَتِيۡمَ ﴿۲﴾ وَلَا يَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ الۡمِسۡكِيۡنِ ﴿۳﴾ فَوَيۡلٌ لِّلۡمُصَلِّيۡنَ ﴿۴﴾ الَّذِيۡنَ هُمۡ عَنۡ صَلَاتِهِمۡ سَاهُوۡنَ ﴿۵﴾ الَّذِيۡنَ هُمۡ يُرَآءُوۡنَ ﴿۶﴾ وَيَمۡنَعُوۡنَ الۡمَاعُوۡنَ ﴿۷﴾

وجہ تسمیہ:

یہ سورۃ الماعون ہے۔ اس کا آخری کلمہ الماعون ہے، اسی مناسبت سے اس کا نام سورۂ الماعون رکھا گیا۔

مکی یا مدنی؟

اکثر حضرات تو یہ فرماتے ہیں کہ یہ سورت مکی ہے؛ لیکن حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی ایک روایت میں ہے کہ یہ مدنی ہے۔[۱] بعض اہل علم کی رائے یہ ہے کہ اس کا آدھا حصہ مکہ مکرمہ میں نازل ہوا۔ وَ لَا یَحُضُّ عَلٰی طَعَامِ الْمِسْکِیْنِ تک۔ جس میں مشرکین کی حرکتوں اور ان کے کرتوتوں کو بیان کیا گیا ہے۔ گویا یہی مناسب ہے کہ اس کا نزول مکہ میں ہوا ہو۔ اور باقی آدھا حصہ جس میں منافقین کی حرکتیں اور ان کے کرتوت ذکر کیے گئے ہیں۔ تو یہی مناسب ہے کہ وہ مدینہ منورہ میں نازل ہوا ہو۔[۲]

شانِ نزول مع اختلافِ روایات:

اوپر والا جو آدھا ہے اس کے شان نزول کے سلسلے میں مختلف روایات ہیں:

حضرت شاہ عبد العزیز صاحب محدث دہلوی رحمہ اللہ نے تفسیر فتح العزیز میں لکھا ہے کہ ابوجہل کی عادت تھی کہ جب کسی صاحب مال آدمی کا انتقال ہونے والا ہوتا، تو وہ اس کے

---

(۱) ابن عطیہ اندلسی رحمہ اللہ ''المحرر الوجیز'' میں تحریر فرماتے ہیں: ''ھی مکیۃ بلاخلاف علمتہ.'' زجاج ونحاس بھی اس کے مکی ہونے کے قائل ہیں، اور علامہ ابن جوزی رحمہ اللہ نے جمہور سے اس کے مکیہ ہونے اور ابن عباس وقتادہ رضی اللہ عنہم سے اس کے مدنیہ ہونے کی صراحت کی ہے۔

(۲) ابن حزم اندلسی رحمہ اللہ ''الناسخ والمنسوخ'' میں رقم طراز ہیں: اس سورت کا نصف مکی ہے اور نصف مدنی۔ یہ سورت شروع سے وَلَا یَحُضُّ عَلٰی طَعَامِ الْمِسْکِیْنِ تک مکہ مکرمہ میں عاص بن وائل کے باب میں نازل ہوئی۔ اور فَوَیْلٌ لِّلْمُصَلِّیْنَ سے آخر تک مدینہ منورہ میں عبداللہ بن ابی بن سلول کے باب میں نازل ہوئی۔ ابن سلامہ مقری، زمخشری اور ابن جوزی نے بھی اس کی صراحت کی ہے۔

پاس جا کر کہتا کہ تم اپنے یتیموں کو میرے حوالے کر دو، میں ان کی کفالت کروں گا اور خبر گیری کروں گا، اور دوسرے ورثاء ان کو نہ ستائیں، ان کا حق ضائع اور برباد نہ کر دیں، میں اس کا خیال رکھوں گا۔ اس طرح مرنے والے سے ان کے یتیموں کی ذمہ داری خود لیتا تھا اور اس طرح ان کے مال پر قابض بھی ہوتا تھا، اور اس کے بعد ان یتیموں کے حقوق کو ضائع کرتا تھا، ان کو ننگا، بھوکا چھوڑ دیتا تھا۔ ایسے یتیموں میں سے ہی ایک یتیم جو اس کا ستایا ہوا تھا، ایک مرتبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آیا، اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے فریاد کی۔ تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کو لے کر ابوجہل کے پاس گئے اور اس کو قیامت کا ڈر بتا کر کہا: ڈر! قیامت میں اللہ تعالیٰ کے سامنے کیا جواب دے گا؟ اس کا حق ادا کر۔ تو اس نے کہا کہ قیامت کیا چیز ہے؟ میں کسی قیامت کو مانتا نہیں ہوں۔ اس کے اس جواب سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دل گرفتہ ہوئے، تو اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے یہ سورت نازل کی گئی۔[۱]

بعض روایات میں دوسرے کفار کے بھی نام آتے ہیں۔ کسی نے عاص بن وائل، کسی نے ولید بن مغیرہ، کسی نے ابوسفیان کا نام بھی لیا ہے۔ گویا مشترک طور پر یہ حالت ان لوگوں کی بیان کی گئی ہے جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے تھے، دوبارہ پیدا کیے جانے اور اس کے بعد آدمی کو اس کے اعمال صالحہ کا اچھا بدلہ، اور برے اعمال کی بری سزا ملنے کے قائل نہیں تھے، ایسے لوگوں ہی کا قصہ ہے۔

کیا آپ نے دیکھا......؟؟؟

اس لیے اس کی شروعات اَرَءَيْتَ الَّذِيْ يُكَذِّبُ بِالدِّيْنِ سے کی گئی۔ (کیا آپ

---

(۱) تفسیر عزیزی: ۲۵۵-۲۵۶ (کتب خانۂ فیض ابرار، انکلیشور، گجرات)۔

نے اسے دیکھا جو جزاء وسزا کو جھٹلاتا ہے؟) لفظ دین کے متعلق سورۂ فاتحہ میں گزرا تھا: مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ (روزِ جزاء کا مالک) جس دن اللہ تبارک وتعالیٰ نیکوکاروں کو ان کے نیک اعمال کا اچھا بدلہ اور گنہگاروں کو ان کے گناہوں کی سزا دیں گے۔ تو جزاء وسزا اس دن دی جائے گی، اس لیے اس کو یوم الدین کہا گیا۔ تو دین اسی بدلے کو کہا جاتا ہے۔ گویا باری تعالیٰ نبی کریم ﷺ کو خطاب کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ کیا آپ نے اس آدمی کو دیکھا جو جزاء و سزا کو جھٹلاتا ہے؟ یعنی جو اس بات کو تسلیم نہیں کرتا کہ مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کیے جائیں گے، اور اُس دوسری زندگی میں جن لوگوں نے نیک اعمال کیے تھے ان کو نیک اعمال کا اچھا بدلہ، اور جن لوگوں نے گناہ کیے تھے ان کو گناہوں کی سزا دی جائے گی۔

دوبارہ زندگی؛ عقلی دلیل:

ہم دنیا میں دیکھتے ہیں کہ ایک آدمی زندگی بھر اچھے اور نیک اعمال کا اہتمام کرتا ہے لیکن اس کے باوجود اس کی زندگی کے دن تکلیفوں میں گزرتے ہیں، ان نیک اعمال کی وجہ سے اس کو دنیا میں کوئی بھلائی پہنچی ہو، اچھے حالات آئے ہوں، ایسا نظر نہیں آتا۔ اور بسا اوقات دیکھتے ہیں کہ ایک ظالم ہے، بدکار ہے، اپنی بدکاری اور ظلم وزیادتی میں پھل پھول رہا ہے، لوگوں کو ستا رہا ہے، لوگوں کے ساتھ ظلم وزیادتی کا معاملہ کرتا ہے، پوری زندگی اسی طرح گزرتی ہے، اور ہمیں کچھ ایسا نظر نہیں آتا کہ اس کو ان برے کاموں کی وجہ سے دنیا میں کوئی تکلیف پہنچی ہو۔ تو اگر دوبارہ زندہ ہونے والے نہیں ہیں تو پھر اِن کا کیا؟ باری تعالیٰ قرآن میں فرماتے ہیں: اَفَمَنْ كَانَ مُؤْمِنًا كَمَنْ كَانَ فَاسِقًا لَا يَسْتَوٗنَ (السجدة-١٨) (جو ایمان والا ہے بھلا وہ فاسق اور بدکار کی طرح ہوسکتا ہے؟ دونوں برابر نہیں ہوسکتے) نیکوکار کو اپنی

نیکی کا اور بدکار کو اپنے گناہوں کا بدلہ ملے گا۔ نیکوکار کو اچھا بدلہ اور بدکار کو اس کی سزا ضرور ملے گی۔ گویا ایک قدرتی نظام ہے، اس کا تقاضہ یہ ہے کہ دوبارہ زندگی ہو، آدمی دوبارہ پیدا کیا جائے۔ یہ اس کی عقلی دلیل ہے۔

بہرحال! یہاں تو اللہ تبارک وتعالیٰ نبیٔ کریم ﷺ کو خطاب فرماتے ہوئے تسلی دے رہے ہیں کہ کیا آپ نے اس آدمی کو دیکھا جو جزاء وسزا کو جھٹلاتا ہے؟ یعنی آخرت کا قائل نہیں ہے۔ اب ظاہر ہے کہ جو آخرت کا قائل نہیں ہے، تو اس سے یہ امید رکھنا کہ وہ حق داروں کے حق کو ادا کرے گا، فضول ہے۔

آگے اس کی کچھ اور علامتیں اور اس کے کچھ اور کرتوت بھی اللہ تبارک وتعالیٰ نے بتلائے:

إنما يأكلون في بطونهم نارا:

فَذٰلِكَ الَّذِيْ يَدُعُّ الْيَتِيْمَ (وہی تو ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے)

اب دیکھیے! اس آیت میں یتیم کو دھکے دینے کو آخرت کے انکار کرنے والے کی ایک نشانی کے طور پر بتلایا گیا، یہ بتلا کر گویا یہ کہا جارہا ہے کہ یہ حرکتیں اصل تو ایسے ہی آدمی کی ہوسکتی ہیں جو آخرت کا قائل نہ ہو، جزاء وسزا کا انکار کرتا ہو۔ اگر کسی مؤمن میں بھی پائی جاتی ہیں، تو اس کے ایمان کا تقاضہ یہ ہے کہ اس میں یہ چیز ہونی نہیں چاہیے۔ یہ حرکتیں اصل تو کافر ہی کی ہونی چاہیے۔ اب یتیموں کے حقوق کو ضائع اور برباد کرنا بھی بڑا خطرناک ہے۔

قرآن پاک میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس کی طرف بھی متوجہ کیا ہے۔ زمانۂ جاہلیت میں عربوں میں دستور یہ تھا کہ بچہ اگر نابالغ ہے، تو اس کو اس کا مال نہیں دیتے تھے۔ جو بڑا ہوتا

تھا وہی مال لے لیتا تھا۔ان کے ہاں ایک جملہ تھا کہ جو آدمی گھوڑے پر سوار ہو، ہاتھ میں نیزہ اور تلوار لے، اور دشمن کا مقابلہ کرے وہی اس بات کا حق دار ہے کہ اس کو وراثت اور مال دیا جائے۔ نابالغ بچے میں اس کام کی طاقت نہیں ہے۔[۱] لہٰذا وہ لوگ اس کا حق مار لیا کرتے تھے۔قرآن کریم میں اس طرح یتیموں کا مال کھا جانے اوراس کے حق کو مارنے پر بڑی سخت وعیدیں سنائی گئیں۔اِنَّ الَّذِیْنَ یَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ الْیَتٰمٰى ظُلْمًا اِنَّمَا یَاْكُلُوْنَ فِیْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا .(النساء:۱۰)(جولوگ بطور ظلم کے یتیموں کا مال کھاتے ہیں وہ اپنے پیٹ میں آگ ڈال رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں اس کو آگ سے تعبیر کیا ہے۔ یہ بڑا خطرناک عمل ہے۔اس سے اپنے آپ کو بچانا چاہیے۔

معاشرے کا جائزہ لینا چاہیے:

دیکھیے! ہمیں اپنے معاشرے کا جائزہ لینا چاہیے۔ہمارے معاشرے میں کوئی کہنے اور ماننے کے لیے تیار نہیں ہوگا کہ میں یتیم کا حق کھاتا ہوں؛لیکن معاشرہ میں کچھ سلسلے جاری ہیں۔عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ جب کسی آدمی کا انتقال ہوتا ہے تو فوری طور پر وراثت تقسیم نہیں کی جاتی، بلکہ اگر ان سے کہا بھی جائے کہ بھائی! شریعت کا حکم ہے کہ جب کسی کا انتقال ہو جائے، تو اس کے مال میں وارثوں کے جو حصے رکھے ہیں، اس کے مطابق اس کو فوری طور پر تقسیم کرے کہ ہر ایک حصے دار کو اس کا حصہ، اور حق دار کو اس کا حق پہنچا دو۔

تو لوگ کہتے ہیں کہ مولانا صاحب! ابھی تو کفن بھی میلا نہیں ہوا، اور آپ بانٹنے کی بات کرتے ہیں!!! یہ تو اجنبی پنے کی باتیں ہوئیں، ہم تو آپس میں مل جل کر رہتے ہیں، ایسی

---

(۱)تفسير القرطبي، سورة النساء وسورة الماعون.

بات کریں گے۔ لیکن تھوڑے دنوں کے بعد ہی آپس میں جھگڑے شروع ہوتے ہیں۔ ایک کہے گا کہ اس نے زیادہ کھالیا، دوسرا کہے گا کہ میرے حصہ میں کم آیا۔ یہ اسی کا نتیجہ ہے۔ خاص کر اگر وارثوں میں کوئی صغیر اور نابالغ ہو، جیسے کبھی باپ کا انتقال ہوجاتا ہے، اس کی کئی اولاد میں ایک- دو لڑکے تو بالغ ہوتے ہیں، اور باقی چھوٹے ہیں، تو شریعت نے اس بات کی تاکید فرمائی کہ ہر ایک کے حصے باقاعدہ تقسیم کر کے الگ کر دیے جائیں، اور جو نابالغ کا حصہ ہے اس کے نام سے اس کو محفوظ کر لیا جائے، اس کا ذاتی، ضروری خرچ ہے، وہ اس میں سے لیا جاسکتا ہے، اس کے علاوہ ایک پائی بھی اس میں سے نہیں لی جاسکتی ہے۔

اب ہمارے یہاں تقسیم نہیں کرتے، اس کا حصہ مشترکہ مال میں موجود ہے، اور سب اس کو کھاتے پیتے ہیں۔ تو عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ یتیم کے اپنے خرچے سے زیادہ اس کے مال سے لیا جاتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس طرح لوگ یتیم کے مال کو کھانے کے جرم میں گرفتار ہوتے ہیں، اور کہنے کو یوں کہتے ہیں کہ ہم تو یتیم کا مال نہیں کھاتے۔ حالاں کہ یہ وعید ان کو بھی لاگو پڑتی ہے۔

یتیم کے معاملے میں احتیاط:

چناں چہ جب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر یہ آیت نازل ہوئی تو صحابہ رضی اللہ عنہم اتنے ڈر گئے کہ جن کے ہاں یتیم ہوا کرتا تھا اس کا سب مال الگ کیا، اس کا کھانا پکانا بھی الگ کیا، اپنے ساتھ نہیں؛ تاکہ یتیم کا مال کھانے کی نوبت نہ آئے۔[۱] اس کی وجہ سے کچھ دشواریاں پیش آئیں کہ اس یتیم اکیلے کے لیے الگ کھانا پکے، اور گھر کے دوسرے لوگوں کے لیے الگ پکے، اس پر

---

(۱) تفسير الطبري وبحر العلوم للسمرقندي وأسباب النزول للواحدي وغيرها.

قرآن پاک نے تنبیہ بھی فرمادی: وَاِنْ تُخَالِطُوْھُمْ فَاِخْوَانُکُمْ ۭ وَاللّٰہُ یَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ (البقرۃ:۲۲۰) اگرمل جل کررہتے ہوتو وہ تمہارے دینی بھائی ہیں، جو یتیم کے مال کو بگاڑنا چاہتا ہے اور جو اس کو ٹھیک رکھنا چاہتا ہے اللہ اس کو خوب جانتا ہے۔ یعنی جس کے دل میں یتیم کے مال کی حفاظت کی نیت ہے اس کو اللہ خوب جانتا ہے۔ اس لیے اگر مقصد یتیم کے مال کو ضائع ہونے سے بچانا ہے، اور الگ سے پکانے کی صورت میں اس کا خرچ زیادہ ہوگا، تو مال ملانے میں کوئی حرج نہیں۔ کیوں کہ ایک آدمی کا کھانا الگ سے پکائیں تو خرچ زیادہ ہوگا۔ ہاں! حساب پکا رکھو، تاکہ ضرورت سے زیادہ خرچ اس کے حصے میں نہ ڈالا جائے۔ بہر حال! جب یہ آیت نازل ہوئی تو پھر صحابہؓ نے ان یتیموں کا حصہ ساتھ کیا۔ حاصل یہ ہے کہ شریعت مطہرہ نے یتیم کے معاملے میں بہت تاکید فرمائی ہے۔

بچوں کے ہدایا کا حکم:

عام طور پر بچوں کا ہدیہ بچوں کے نام سے آتا ہے کہ یہ فلاں کے لیے ہے، اب وہ باپ کے پاس ہے، تو باپ، باپ ہونے کے باوجود اس بچے کے مال کو اس کی حقیقی ضرورتوں کے علاوہ میں استعمال نہیں کرسکتا ہے۔ اگر کرے گا، تو وہ زیادتی کرنے والا قرار دیا جائے گا۔ نابالغ کے مال میں بڑی احتیاط برتی گئی ہے، اس کا خاص لحاظ کرنا چاہیے۔ فقہاء نے یہاں تک لکھا ہے کہ آپ نے اپنے بچے کی نیت سے کپڑے بنوائے، جب اس کو پہنائے تو اس کے ہوگئے، بڑا ہونے کے بعد اسی کے کپڑے جس کا سائز چھوٹا پڑ گیا، اس کو بعد والے بھائیوں کو دے دیتے ہیں، یہ جائز نہیں ہے۔ کیوں کہ یہ اسی نابالغ بچے کی ملکیت ہے، آپ کو اس میں تصرف کرنے کا حق نہیں ہے۔ اگر آپ دینا چاہتے ہیں تو اس کی موجودہ

حقیقی قیمت تجویز کرو، اتنی قیمت اس کے نام پر الگ جمع کرو، پھر وہ کسی کو دو۔ اسی لیے فقہاء نے احتیاط اسی میں لکھا ہے کہ بچوں کو باقاعدہ مالک قرار نہ دیا جائے، اپنی ملکیت میں رکھتے ہوئے ان کو پہنایا جائے۔ بہر حال! شریعت نے احتیاط کا پہلو مدنظر رکھا ہے۔ لیکن عام طور پر ہمارے ہاں اس کو نہیں دیکھا جاتا۔ بچوں کے لیے ہدیے، پیسے اور بہت سی چیزیں آتی ہیں، عام طور پر عورتیں ان کے ہدیے کے پیسے خرچ ہی کر ڈالتی ہیں، یہ بہت خطرناک چیز ہے۔ کل قیامت میں حساب دینے کا وقت آئے گا تو پتا چلے گا۔ بہر حال! یہ نابالغ کا مسئلہ بڑا کٹھن ہے۔ یہ تو مطلق نابالغ کی بات ہوئی۔

یتیم کا مسئلہ سنگین:

اور اگر نابالغ یتیم ہے، جیسے شوہر کا انتقال ہوگیا، چاہے بچے کی ماں ہے؛ لیکن بچہ تو نابالغ ہونے اور باپ کے انتقال ہوجانے کی وجہ سے یتیم ہے۔ اس کا مسئلہ بڑا سنگین ہے۔ تو اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتے ہیں: فَذٰلِكَ الَّذِیْ یَدُعُّ الْیَتِیْمَ (وہی تو ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے) ذرا ہمیں بھی اپنا جائزہ لینے، سوچنے اور دیکھنے کی ضرورت ہے کہ کہیں ہم تو اس وعید میں نہیں آتے ہیں؟ ہر آدمی اپنے آپ کو دیکھ لے، اپنے حالات کا جائزہ لے لے۔

دے دے یا دلا دے:

وَلَا یَحُضُّ عَلٰی طَعَامِ الْمِسْکِیْنِ. (اور وہ مسکین کو کھانا دینے کی ترغیب نہیں دیتا) یعنی کسی غریب کو کھانا کھلانے اور دینے کی ترغیب نہیں دیتا۔ خود تو کیا کھلاتا؟ کسی دوسرے کو بھی یہ نہیں کہتا کہ غریبوں کو کھلاؤ۔ یعنی وہ اس درجہ کا بخیل ہے۔ اگر ایک آدمی استطاعت نہ ہونے کی وجہ سے غریبوں کو کھانا نہیں کھلاتا تو کوئی حرج نہیں، گنہگار نہیں ہے۔ لیکن اگر ایسا

کوئی موقع ہو کہ مسکین اور غریب بھوک میں مبتلا ہیں، حاجت مند ہیں، تو لوگوں کو ان کو کھلانے کی ترغیب دینی چاہیے۔ مصیبت زدہ کی مصیبت دور کرنے کی ترغیب دینی چاہیے۔ جیسے آج کل کیرالہ کے سیلاب زدگان کا مسئلہ ہے، ان کے لیے خود مدد نہیں کر سکتا تو ترغیب دینی چاہیے۔

......تو ترغیب دینا واجب ہے:

البتہ یہ جانتا ہے کہ میں اس شخص کو ترغیب دوں گا تو اس پر کوئی اثر ہونے والا نہیں ہے؛ بلکہ الٹا ناراض ہوگا تو اس کو ترغیب دینا ضروری نہیں ہے۔ ایسے لوگ جن سے امید اور توقع ہو ان کو ترغیب دی جاسکتی ہے۔ اور اگر بھوک کی وجہ سے بالکل مرنے کے قریب ہو جائے، تو اگر طاقت ہے تو خود کھلانا ورنہ دوسروں کو ترغیب دینا واجب لکھا ہے۔

بہر حال! جزاء وسزا کا انکار، یتیم کو دھکے دینا اور مسکین کو کھانا کھلانے اور کھانا دینے کی ترغیب نہ دینا، یہ تین باتیں مشرکین کے متعلق بتلائی گئیں۔

نماز سے غفلت؛ تین صورتیں:

فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ

ویل بڑی خرابی کو کہتے ہیں۔ عذاب کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ اس سورت کے آخری حصے میں جو برائیاں بتلائی گئی ہیں وہ منافقین میں تھیں، اور مکی دور میں منافقین نہیں تھے، بلکہ مدنی دور میں منافقین وجود میں آئے ہیں، اس لیے بہت سے اہل علم یوں کہتے ہیں کہ یہ آخری حصہ مدینہ میں نازل ہوا۔

فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ (پھر بڑی خرابی ہے ان نماز

پڑھنے والوں کے لیے جو اپنی نماز سے غفلت سے برتتے ہیں)۔

نماز سے غفلت برتنے کی بہت سی صورتیں ہوسکتی ہیں، مثلاً: بہت سے منافقین وہ تھے کہ کوئی دیکھ رہا ہوتو نماز پڑھتے تھے، کوئی نہ دیکھ رہا ہو، تنہائی میں ہوں تو چھوڑ دیتے تھے، آج مسلمانوں میں بھی ایسے لوگ ہیں کہ لوگوں کو معلوم ہو رہا ہے تو نماز پڑھیں گے تاکہ لوگ یہ نہ سمجھیں کہ یہ نماز نہیں پڑھتا۔ اور تنہا ہوں، جہاں کوئی دیکھنے والا موجود نہ ہو تو نماز چھوڑ دیتے ہیں۔

نماز کے معاملے میں غفلت سے کام لیتے ہیں، مثلاً: آگے پیچھے کر دیتے ہیں، وقت کی رعایت نہیں کرتے، کبھی وقت میں پڑھی، کبھی اس کو چھوڑ بھی دی۔

بے توجہی:

یا جیسی توجہ، دھیان اور جی لگا کر پڑھنی چاہیے ویسی نہیں پڑھتے ہیں۔ یہ سب نماز سے غفلت میں داخل ہے۔ یا جیسے اس کے فرائض، واجبات، مستحبات، سنن کو ادا کرنے کا اہتمام نہیں کرتے۔ بہت سے لوگ وقت ملتا ہے تو پڑھتے ہیں، دنیوی کام کاج آ گیا تو نہیں پڑھتے، وہ بھی اس میں داخل ہے۔ یہ باتیں جو بیان کی گئی ہیں اصل میں وہ تو منافقین کی حرکتیں ہیں؛ لیکن ان کو بیان کر کے مؤمنین کو بھی متنبہ کیا جا رہا ہے کہ یہ منافقین کے کام ہیں، اپنے آپ کو ان سے بچاؤ۔ تاکہ کہیں تم پر یہ لیبل نہ لگ جائے۔

الَّذِيْنَ هُمْ يُرَآءُوْنَ (جو دکھاوا کرتے ہیں، دکھلانے کے لیے نماز پڑھتے ہیں)

بہت سے وہ ہوتے ہیں کہ کوئی دیکھ رہا ہو تو پڑھ رہے ہیں، ورنہ نہیں پڑھتے۔ یا دیکھ رہا ہو تو ذرا اچھی طرح پڑھتے ہیں، اور کوئی دیکھنے والا نہ ہو تو ایسے ہی مرغ کی طرح ٹھونگیں مار کر

جلدی جلدی پوری کر دیتے ہیں۔

یہ ایک قدم آگے نکل گیا:

حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب دہلویؒ فرماتے ہیں کہ یہ ریا کار بعض چیزوں میں شرک سے بھی آگے بڑھ جاتے ہیں۔ اس لیے کہ ریا کار انسانوں کو یعنی جن کو دکھلانے کے لیے یہ عمل کر رہا ہے ان کو اللہ کے مقابلے میں ترجیح دے رہا ہے۔ وہ تو جانتا ہے کہ اللہ بھی دیکھ رہے ہیں، تو یہ اللہ کی خاطر عمل نہیں کرتا؛ بلکہ انسانوں کے دکھلانے کے لیے کرتا ہے۔ تو گویا وہ اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں انسانوں کو عظمت دیتا ہے۔ مشرکین تو شریک کرتے ہیں، یہ تو ایک قدم آگے نکلا۔ پھر یہ کہ شرک کرنے والے اپنی دنیوی ضرورتوں کے معاملے میں اللہ کے ساتھ دوسروں کو شریک کرتے ہیں، جیسے کسی کے پاس اولاد مانگی، کسی سے روزی کا سوال کیا؛ لیکن یہ تو خالص عبادت؛ نماز، جو اللہ کے لیے پڑھی جانی چاہیے، وہ دوسروں کو دکھلاتا ہے تو یہ ایک قدم آگے نکل گیا۔ الحاصل شاہ عبدالعزیز صاحبؒ فرماتے ہیں کہ یہ دکھلاوے والا شرک بہت خطرناک ہے۔[1]

ماعون سے مراد:

وَيَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ. (اور دوسروں کو معمولی چیز دینے سے بھی انکار کرتے ہیں)

ایک تو جتنے بھی اعمال خیر کرتے ہیں، دکھلانے کے لیے کرتے ہیں، یہ منافقین کی خاصیت ہے۔ اور دوسرا ماعون سے بھی انکار کرتے ہیں۔

ماعون کا کیا مطلب؟ اس سلسلے میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ، ابن عمر اور حضرت

---

(۱) تفسیر عزیزی: ۶۵۸-۶۵۹ (کتب خانہ فیض ابرار، انکلیشور، گجرات)

علی[رض] سے منقول ہے کہ یہاں ماعون سے زکوٰۃ مراد ہے۔[۱] یعنی وہ زکوٰۃ ادا نہیں کرتے۔ اصل ماعون تو تھوڑی سی چیز کو کہتے ہیں۔ چوں کہ مال میں فرض زکوٰۃ مال کا چالیسواں حصہ ہے، (ڈھائی فی صد) تو ڈھائی فی صد کوئی بڑی چیز نہیں ہے، معمولی چیز ہے۔ لیکن یہ ڈھائی فی صد ہونے کے باوجود بہت سے لوگ اس کو ادا نہیں کرتے۔ گویا یہ منافقین زکوٰۃ ادا نہیں کرتے۔ ان پر دوسرے حقوق ہیں جن کے طلب کرنے والے بندوں میں سے ہیں ان کے حقوق تو ان بندوں کے ڈر سے ادا کرتے ہیں، اس لیے کہ اگر ادا نہیں کریں گے، تو لوگوں میں ہماری رسوائی ہوگی، وہ ہمارا (ناطقہ بند) کریں گے، یا حاکم کے ہاں نالش کر دیں گے، اس کی وجہ سے لوگوں میں ہمارا نام بدنام ہوگا؛ لیکن زکوٰۃ نہیں دیتے تو کس کو پتا چلتا ہے؟ وہ اللہ سے نہیں ڈرتے اس لیے زکوٰۃ ادا نہیں کرتے۔ بہر حال! حضرت عبداللہ بن عباس[رض] (کی ایک روایت میں) حضرت علی[رض] اور حضرت عبداللہ بن عمر[رض] کے نزدیک ماعون سے زکوٰۃ مراد ہے۔

دوسرا مطلب:

اور حضرت عبداللہ بن عباس[رض] کی دوسری روایت میں اور حضرت عبداللہ بن مسعود[رض] سے مروی ہے کہ ماعون سے وہ معمولی چیز مراد ہے جس کے آپس میں استعمال کے لیے، عاریۃ کے طور پر لوگوں میں لینے دینے کا دستور ہوتا ہے۔[۲] جیسے آپ کے ہاں مہمان زیادہ آ گئے، ضرورت پیش آ گئی، آپ کے ہاں کوئی بڑا پتیلا نہیں ہے۔ پڑوسی کے پاس گئے کہ آج ہمارے ہاں آٹھ دس مہمان ہو گئے ہیں، تمہارا بڑا پتیلا دے دو۔ تو دیتے ہیں۔ یا دیگر

---

(۱) تفسير الطبري وتفسير القرطبي.

(۲) تفسير الطبري وتفسير القرطبي.

استعمال کی چیزیں، ڈول، آگ، پانی، نمک وغیرہ۔ اُس زمانے میں عام طور پر ایسا ہوتا تھا۔ تو ان چیزوں کا پڑوسیوں میں عاریت کے طور لینے دینے کا رواج ہے، یہ لوگ بخل کی وجہ سے وہ بھی نہیں دیتے۔ اور اہل حرفت، اہل صنعت، پیشہ ور لوگوں کے آپس کے اوزار بھی اس میں آجاتے ہیں۔ ایک الیکٹریشین ہے، دوسرے الیکٹریشین کو کسی اوزار کی ضرورت پیش آئی تو وہ آپس میں دیتے ہیں؛ لیکن اگر کوئی نہ دے تو اسی ماعون کا مصداق بنے گا۔ یا ایک پلمبر دوسرے پلمبر کو کسی اوزار کی ضرورت پڑے، تو اس کو اپنے اوزار دیتا ہے؛ لیکن اگر کوئی نہ دے تو وہ اسی ماعون میں داخل ہو جائے گا۔ یا اہل علم ہے، تو وہ آپس میں قلم، کاغذ وغیرہ اشیاء کی آپس میں لین دین کرتے ہیں۔ اور کوئی ہونے کے باوجود نہ دے، تو یہ بھی اسی ماعون میں داخل ہوگا۔ کیوں کہ عام طور پر ایسی چیز سے منع نہیں کیا جاتا۔

بہر حال! اہل ایمان کو چاہیے کہ وہ کفار اور منافقین کی چیزوں سے اپنے آپ کو ان برائیوں سے بچانے کا اہتمام کریں۔ تا کہ ان کے حق میں جو وعیدیں آئی ہیں، ان کا مصداق بننے کی نوبت نہ آئے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ ہم سب کو ان چیزوں کا اہتمام نصیب فرمائے۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

سورۂ قریش

(مؤرخہ:۲۶؍محرم الحرام ۱۴۴۰ھ مطابق ۷؍اکتوبر ۲۰۱۸ء،شب یک شنبہ)

الحمد لله نحمده ونستعينه ونستغفره ونؤمن به ونتوكل عليه ونعوذ بالله من شرور أنفسنا ومن سيئات أعمالناونعوذبالله من شرورأنفسنا ومن سيئات أعمالنا من يهده الله فلامضل له ومن يضلله فلا هادي له ونشهد أن لا إلٰه إلا الله وحده لا شريك له ونشهد أن سيدنا و مولانا محمداً عبده ورسوله أرسله إلى كافة الناس بشيراً ونذيراً وداعياً إلى الله بإذنه وسراجاً منيراً صلى الله تعالى عليه وعلى اٰله وأصحابه وبارك وسلم تسليماً كثيراً كثيراً .

أمابعد! فأعوذبالله من الشيطٰن الرجيم ○ بسم الله الرحمٰن الرحيم ○

لِاِیۡلٰفِ قُرَیۡشٍ ۝۱ اٖلٰفِهِمۡ رِحۡلَةَ الشِّتَآءِ وَ الصَّیۡفِ ۝۲ فَلۡیَعۡبُدُوۡا رَبَّ هٰذَا الۡبَیۡتِ ۝۳ الَّذِیۡۤ اَطۡعَمَهُمۡ مِّنۡ جُوۡعٍ ۬ۙ وَّ اٰمَنَهُمۡ مِّنۡ خَوۡفٍ ۝۴

قریش کون ہیں......؟؟؟

یہ سورۂ قریش ہے بقول جمہور مکہ مکرمہ میں نازل ہوئی۔ اور بقول ضحاک وکلبی مدینہ منورہ میں نازل ہوئی۔

قریش،عرب کے ایک بڑے قبیلے کا نام ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا تعلق اسی قبیلے سے

ہے۔ حضور اکرم ﷺ کا نسب مبارک اس طرح ہے: محمد بن عبد الله بن عبد المطلب بن هاشم بن عبد مناف بن قصي بن كلاب بن مرة بن كعب بن لؤي بن غالب بن فهر بن مالك بن نضر بن كنانة. نضر بن کنانہ تیرھویں پشت پر نبی اکرم ﷺ کے جد اعلیٰ ہیں، ان کی اولاد قریش کہلاتی ہے۔ حضور اکرم ﷺ کا ارشاد ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضرت اسماعیلؑ کی اولاد میں کنانہ کو منتخب فرمایا، اور ان کی اولاد میں قریش کو، اور قریش میں بنو ہاشم کو، اور بنو ہاشم میں مجھے یعنی نبی کریم ﷺ کو منتخب فرمایا۔[۱]

نضر بن کنانہ- جو نبی کریم ﷺ کے تیرھویں نمبر کے جد اعلیٰ ہیں- کی اولاد کو قریش کہا جاتا ہے۔ یہ لوگ حرم کے باہر بھی پھیلے ہوئے اور منتشر تھے۔ تو نبی کریم ﷺ کے پانچویں جد اعلیٰ قصی بن کلاب نے جو قریش حرم سے باہر منتشر تھے ان کو جمع کر کے حرم میں آباد کیا کہ آپ لوگ حرم ہی میں آباد رہو، حرم سے باہر نہیں۔ اسی لیے ان قصی کو مُجَمِّعْ کہا جاتا ہے۔ اور گویا یہی قریش کو حرم میں لا کر آباد کرنے والے ہوئے۔ اس کے بعد سے قریش کے تمام قبائل حرم ہی میں آباد تھے۔

قریش کی وجہ تسمیہ:

قریش کی وجہ تسمیہ یہ بیان کی گئی ہے کہ یہ تو منتشر تھے، ان کو پھر حرم میں لا کر جمع کیا اور آباد کیا، علامہ قرطبیؒ فرماتے ہیں کہ عربی زبان میں تَقَرُّش منتشر لوگوں کے اکٹھا ہو جانے کو کہتے ہیں، تو چوں کہ یہ منتشر تھے، اور حضرت قصی بن کلاب کی کوششوں سے پھر حرم میں مجتمع ہوئے، اور وہیں آباد ہوئے اس اعتبار سے قریش کہا جاتا ہے۔[۲]

---

(۱) صحيح مسلم: ۲۲۷۶.

(۲) تفسير القرطبي، سورة قريش.

اور دوسری وجہ تسمیہ حضرت شاہ عبد العزیز صاحب دہلویؒ نے تفسیر فتح العزیز میں بیان کی ہے جو حضرت عبد اللہ بن عباسؓ سے بھی منقول ہے، فرماتے ہیں کہ قریش ایک سمندری جانور کا نام ہے، جو تمام جانوروں پر غالب آتا ہے، تو یہ قبیلہ بھی اپنی فصاحت و بلاغت اور شجاعت وسخاوت کی وجہ سے عرب کے تمام قبائل پر غالب تھا، اس لیے اس کو قریش نام دیا گیا۔[۱] قریش کی یہ دو وجہ تسمیہ زیادہ مشہور ہیں، اور بھی اس سلسلے میں کچھ باتیں کہی گئی ہیں۔

بہر حال! قریش ہی کے ان تمام قبائل کی شاخیں حرم ہی میں کعبۃ اللہ کے آس پاس آباد تھیں، ان ہی کے نام پر اس سورت کو نام دیا گیا ہے۔

وادیِ غیر ذی زرع میں آباد قوم:

یہ سب مکہ مکرمہ میں حرم میں آباد تھے، اور حرم، مکہ مکرمہ ایک ایسی وادی ہے- وادی پہاڑوں کے درمیان کے ہموار علاقے کو کہتے ہیں، جس کو گجراتی میں ખીણ کہا جاتا ہے- جہاں معیشت کا کوئی سبب موجود نہ تھا، نہ کھیتی باڑی، نہ باغات، نہ ہی کوئی صنعت۔ ایسی جگہوں پر عموماً لوگ آباد نہیں ہوتے، بلکہ لوگ ایسی جگہوں پر آباد ہوتے ہیں، جہاں معیشت کے اسباب میسر ہوں، جن کے ذریعے وہ اپنا گذر بسر اطمینان وسکون کے ساتھ کر سکیں؛ لیکن مکہ ایک وادیِ غیر ذی زرع تھی۔

قرآن پاک میں وہ دعا موجود ہے، جو سیدنا حضرت ابراہیم علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنی بیوی حضرت ہاجرہ علیہا السلام اور اپنے صاحب زادے حضرت اسماعیلؑ کو وادیِ غیر ذی

---

(۱) تفسیر القرطبي و تفسیر عزیزي وغیرھما.

زرع میں چھوڑتے وقت کی تھی: رَبَّنَآ اِنِّیْٓ اَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّیَّتِیْ بِوَادٍ غَیْرِ ذِیْ زَرْعٍ عِنْدَ بَیْتِكَ الْمُحَرَّمِ رَبَّنَا لِیُقِیْمُوا الصَّلٰوةَ فَاجْعَلْ اَفْىِٕدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِیْٓ اِلَیْهِمْ وَارْزُقْهُمْ مِّنَ الثَّمَرٰتِ۔(ابرھیم:۳۷) (اے ہمارے پروردگار! میں نے اپنی اولاد میں سے بعض کو ایک ایسی وادی میں، جہاں کوئی کھیتی نہیں ہوتی ہے، ٹھہرایا ہے تیرے حرمت والے گھر کے پاس، مقصد یہ ہے کہ یہ لوگ نماز کو قائم کریں۔ اور اے اللہ! لوگوں کے دلوں کو ان کی طرف مائل فرمادے، اور ان کو پھلوں سے روزی عطا فرما) ان ہی کی اس دعا کی برکت ہے کہ وہاں خود کوئی پیداوار نہ ہونے کے باوجود ساری دنیا کے پھل آتے ہیں، اور لوگ اطمینان اور سکون کے ساتھ ان کو استعمال کرتے ہیں۔

اہلِ مکہ پر بہت بڑا انعام:

ایک اور موقع پر حضرت ابراہیم علیٰ نبینا وعلیہ الصلاۃ والسلام نے دعا کی تھی: رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا وَّارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ۔(البقرۃ-۱۲۶) (اے اللہ! اس مکہ مکرمہ کو امن والا شہر بنا، اور اس کے رہنے والوں کو پھلوں کی روزی عطا فرما) عرب قبائل میں آپسی عداوتیں، دشمنیاں ہوا کرتی تھیں، اور اس علاقے میں کوئی ذریعۂ معیشت نہ ہونے کی وجہ سے ان میں غربت اور افلاس تھا، جس کے نتیجے میں وہ آپس میں لوٹ مار کرتے تھے، عداوتوں کی بنا پر ایک دوسرے کا قتل کرتے تھے، نہ جان محفوظ، نہ مال محفوظ، نہ عزت وآبرو محفوظ تھی؛ لیکن حضرت ابراہیم علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کی اس دعا کی برکت سے اللہ تبارک وتعالیٰ نے مکہ مکرمہ کو امن والا شہر بنایا کہ وہاں کوئی کسی کو چھیڑتا نہیں تھا۔ سب کی جان، مال اور عزت وآبرو بھی محفوظ تھی۔ یہاں تک کہ حرم اور کعبۃ اللہ کی برکت سے شکار کے جانور تک وہاں محفوظ رہتے

تھے۔ یہ اللہ تبارک وتعالیٰ کا اہل مکہ پر ایک بہت بڑا انعام تھا۔

تجارت کے دو سفر:

نبیٔ کریم ﷺ کی ولادت سے پہلے قریش کا جو قبیلہ وہاں آباد تھا، ان کے لیے ایسی جگہ میں جہاں بظاہر معیشت کا کوئی سامان نہیں تھا، اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان کے لیے ایک سبب یہ پیدا فرما دیا کہ نبیٔ کریم ﷺ کے پردادا، حضرت عبد المطلب کے والد، ہاشم نے با قاعدہ تجارتی اسفار کا سلسلہ شروع کیا، وہ لوگوں کا مال لے کر سفر کرتے تھے۔ اور قریش کے تمام قبائل، شاخوں میں سے ہر ایک کا مال مضاربت کے طور پر لے کر جاتے تھے، تجارت کے ذریعے کمائی حاصل کرتے تھے، اور سب کو ان کے حصے کے مطابق پہنچاتے تھے جس کی وجہ سے سب لوگ بڑے اطمینان اور سکون سے اپنی زندگیاں گزارتے تھے۔

اور یہ تجارت کے سفر دو ہوتے تھے: (۱) گرمی کے زمانے میں شام کا تجارتی سفر کرتے تھے؛ شام کا علاقہ ٹھنڈا ہونے کی وجہ سے۔ وہاں کی چیزیں مکہ مکرمہ میں لاتے تھے اور مکہ میں بیت اللہ کی زیارت کے لیے، حج وعمرہ کے لیے آنے والے لوگ وہ چیزیں ان سے خریدتے تھے اس طرح ان کی تجارت ہوا کرتی تھی۔ (۲) سردی کے زمانے میں ان کا دوسرا تجارتی سفر یمن کی طرف ہوتا تھا؛ یمن گرم علاقہ ہے، تو وہاں کم سردی ہوتی تھی، لہٰذا وہ سردی کے زمانے میں آب وہوا کے اعتبار سے زیادہ موافق رہتا تھا۔

تو یہ لوگ تجارت کی غرض سے یہ دو بڑے سفر کرتے تھے۔ اور اس کے عادی تھے۔ عادی ہونے کی وجہ سے اتنے طویل طویل سفر بھی ان کے لیے کوئی دشوار اور مشکل نہیں تھے۔ جب مشکل چیز کا بھی آدمی عادی بن جاتا ہے، تو اس کے لیے عادت کی وجہ سے وہ چیز آسان

ہوجاتی ہے۔ یہ اللہ تبارک وتعالیٰ کا ان کے اوپر ایک انعام تھا کہ ذریعۂ معاش کے طور پر انہوں نے تجارت کو اختیار کیا تھا، اور دونوں موسموں میں الگ الگ جگہ کا تجارتی سفر کرتے تھے، اور اس کی عادت ہونے کی وجہ سے ان کے لیے یہ تجارتی اسفار طویل ہونے کے باوجود بڑے آسان تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے اس انعام کا اس سورت میں تذکرہ فرمایا ہے۔

حرم کی نسبت پر امن وامان:

دوسری بات یہ ہے کہ پورا علاقہ بالخصوص حجاز وغیرہ کا علاقہ جہاں نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیدائش ہوئی، وہاں مستقل کبھی کوئی حکومت قائم نہیں رہی، اور عام طور پر امن وامان قائم کرنا قانون کو جاری کرنا یہ حکومتوں کا کام ہوا کرتا ہے۔ اور وہاں آج تک ایسی کوئی معقول حکومت نہیں تھی جو قانون کو جاری کرتی اور امن وامان قائم کرتی۔ جس کی وجہ سے آپس میں بہت کچھ قتل وغارت اور لوٹ مار ہوتی تھی؛ لیکن اس کے باوجود قریش چوں کہ اللہ کے گھر کے متولی اور نگہبان تھے، اس بیت اللہ کی نسبت کی وجہ سے اللہ تبارک وتعالیٰ نے لوگوں کے قلوب میں محبت ڈالی تھی، جس کا نتیجہ یہ تھا کہ اتنے طویل سفر میں وہ تجارت کے بڑے بڑے قافلے لے کر جاتے تھے۔

قافلے کی لمبائی کا اندازہ آپ اس سے لگا سکتے ہیں کہ غزوۂ بدر کے موقع پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ابوسفیان کی ماتحتی میں جانے والے قریش کے جس قافلے کا تعاقب کیا تھا، اس میں سامان سے لدے ہوئے ایک ہزار اونٹ تھے۔ آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ایک- ایک ہزار اونٹوں کا قافلہ سامان سے لدا ہوا!!! اور لے جانے والے چالیس پچاس آدمی!!! گویا ایسے بدامنی کے ماحول میں بھی یہ لوگ اس طرح جاتے تھے کہ ان کی جان ومال پر حرم

کی نسبت کی وجہ سے کوئی ہاتھ نہیں ڈالتا تھا۔ اتنے طویل اسفار میں بھی اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے مال وجان کی حفاظت حاصل تھی ۔ یہ اللہ تبارک وتعالیٰ کا ایک بہت بڑا انعام تھا، جو اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے انہیں دیا گیا تھا۔ نیز ان تجارتی اسفار کے نتیجے میں ان کو کھانے پینے اور معیشت کے اسباب بآسانی میسر تھے ۔ یہ اللہ تعالیٰ کی وہ نعمتیں تھیں جن نعمتوں کو اللہ تعالیٰ نے خاص طور پر اس سورت میں بیان کیا ہے، کہ اس گھر کے مالک یعنی اللہ تعالیٰ نے تم کو بھوک میں کھانا دیا اور خوف سے امن دیا، یعنی ساری دنیا تو ہمیشہ خطرہ میں رہتی ہے۔ قرآن پاک میں سورۂ عنکبوت میں باری تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا جَعَلْنَا حَرَمًا اٰمِنًا وَّيُتَخَطَّفُ النَّاسُ مِنْ حَوْلِهِمْ. (العنکبوت-٦٧) (کیا یہ لوگ اس بات کو دیکھتے نہیں کہ ہم نے حرم کو امن والی جگہ بنایا جہاں یہ لوگ پورے اطمینان اور سکون کے ساتھ زندگی گزارتے ہیں؟ حالاں کہ اس کے آس پاس کا جو علاقہ ہے وہاں سے لوگ اچک لیے جاتے ہیں) یعنی وہاں ان کی جانیں محفوظ نہیں ہیں، لیکن حرم کی نسبت پر اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان کو یہ امن وامان اور سکون عطا فرمایا ہے۔ تو یہ اللہ تبارک وتعالیٰ کا ایک بہت بڑا انعام ہے، جس کو اللہ تعالیٰ نے اس سورت میں ذکر کیا ہے۔

تین احسانات:

اللہ تعالیٰ نے اس سورت میں اپنے تین احسانات گنوائے ہیں۔ (۱) سردی اور گرمی دونوں موسموں میں تجارت کے طویل طویل دو سفر امن وسکون کے ساتھ کرنا، کوئی ان کے مال کو چھیڑتا نہیں تھا۔ (۲) ایک وادئ غیر ذی زرع میں آباد ہونے کے باوجود کھانے پینے کی چیزیں اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے کثیر مقدار میں دوسری جگہوں سے وہاں پہنچائی

جاتی تھیں۔(۳) کوئی امن قائم کرنے والی حکومت موجود نہ ہونے کے باوجود وہاں ہر طرح کا امن وامان تھا۔ان احسانات کو گنوا کر اللہ تبارک وتعالیٰ ان لوگوں کو متوجہ کر رہے ہیں کہ جس اللہ نے تم کو ان نعمتوں سے نوازا ہے؛ چاہیے تو یہ تھا کہ تم بتوں کی پوجا کرنے کے بجائے اس گھر کے مالک یعنی اللہ کی عبادت کرتے۔

ایک سبق:

اس میں ہمارے لیے سبق یہ ہے کہ دین کی نسبت پر اللہ تبارک وتعالیٰ نے اگر کسی کو دنیوی نعمتوں سے نوازا ہو، یا اعزاز واکرام کی شکلیں عطا فرمائی ہوں تو اس کا شکر یہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طاعت اور فرماں برداری میں زیادہ اہتمام کیا جائے۔بخاری شریف میں حضرت مغیرہ بن شعبہؓ کی روایت ہے کہ نبیِ کریم ﷺ تہجد کی نماز میں اتنا طویل قیام فرماتے تھے کہ آپ ﷺ کے پاؤں مبارک پر ورم آجاتا تھا۔صحابہؓ نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول ! آپ کی تو اگلی پچھلی خطائیں اللہ تبارک وتعالیٰ نے معاف کردی ہیں۔لِيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ.(الفتح-۲)اس کے باوجود آپ اتنی مشقتیں اٹھاتے ہیں؟ طویل طویل عبادتیں کرتے ہیں،جس کے نتیجے میں پاؤں پر ورم آجاتا ہے؟ اس کے جواب میں حضور ﷺ نے فرمایا: أفلا أكون عبداً شكوراً؟(کیا میں اللہ کا شکر گزار بندہ نہ بنوں؟)[1] یعنی جب اللہ نے مجھے یہ نعمت عطا فرمائی ہے،تو اب اس کی شکر گزاری یہ ہے کہ میں اللہ کی اطاعت اور فرماں برداری میں اور زیادہ اہتمام کا لحاظ کروں۔تو اس میں ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ دین کی نسبت پر اللہ کی طرف سے جو نعمتیں دی جاتی ہیں ان کا حق یہ ہے کہ آدمی اللہ

---

(۱)صحيح البخاري: ۱۱۳۰ و ۴۸۳۶ و ۴۸۳۷ و ۶۴۷۱.

تعالیٰ کی اطاعت وفرماں برداری میں مزید اہتمام کرے۔نہ یہ کہ اللہ کی طرف سے غفلت کا معاملہ برتے۔اسی کو اس سورت میں بتایا گیا ہے۔

ترجمہ:

لِاِیْلٰفِ قُرَیْشٍ

ایلٰف: عادی ہونا، مانوس ہونا، کسی چیز کے ساتھ طبعی طور پر مناسبت ہونا۔ چوں کہ قریش کے لوگ عادی ہیں۔

اٖلٰفِهِمْ رِحْلَةَ الشِّتَآءِ وَالصَّيْفِ

وہ سردی اور گرمی کے موسموں میں سفر کرنے کے عادی ہیں (سردی میں یمن کی طرف اور گرمی میں شام کی طرف)

فَلْيَعْبُدُوْا رَبَّ هٰذَا الْبَيْتِ۔

اس لیے ان کو چاہیے کہ وہ اس گھر کے مالک کی عبادت کریں۔(کون اس گھر کا مالک؟)

الَّذِيْٓ اَطْعَمَهُمْ مِّنْ جُوْعٍ ۙ وَّاٰمَنَهُمْ مِّنْ خَوْفٍ

جس نے بھوک کی حالت میں ان کو کھانا دیا اور بدامنی سے انہیں محفوظ رکھا۔

جب اللہ تعالیٰ کے یہ انعامات تم پر ہیں، لہٰذا تم کو بھی اللہ تبارک وتعالیٰ کی عبادت کا حق ادا کرنا چاہیے، اوراس کے علاوہ کسی اور کو ماننا نہیں چاہیے۔اس سورت میں یہ سبق دیا گیا ہے۔

دوسرا سبق:

اس سورت میں ایک سبق اور بھی ہے کہ جہاں لوگوں کی معاشی ضرورتیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے پوری کی جاتی ہوں، اور جہاں وہ رہتے ہیں وہاں امن وامان کی فضا ہو، تو یہ دو

اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمتیں ہیں، ان کی قدر کرنی چاہیے۔ جس علاقے میں آپ رہتے ہیں وہاں آپ کے لیے اسباب معاش آسانی کے ساتھ میسر ہیں، آپ اپنا گذر بسر اطمینان کے ساتھ کر لیتے ہیں، اور وہاں کوئی خوف او ڈر بھی نہیں ہے، امن وامان کی فضا ہے تو یہ دو ایسی بڑی نعمتیں ہیں کہ دنیا کی کوئی دوسری نعمت اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔

اللہ تعالیٰ ہم کو بھی ان نعمتوں کی قدر دانی کی توفیق اور سعادت عطا فرمائے۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

سورۂ فیل

(مؤرخہ ۱۱؍صفر المظفر ۱۴۴۰ھ مطابق ۲۰؍اکتوبر ۲۰۱۸ء، شب یک شنبہ)

الحمد لله نحمده ونستعينه ونستغفره ونؤمن به ونتوكل عليه ونعوذ بالله من شرور أنفسنا ومن سيئات أعمالنا ونعوذ بالله من شرور أنفسنا ومن سيئات أعمالنا من يهده الله فلا مضل له ومن يضلله فلا هادي له ونشهد أن لا إلٰه إلا الله وحده لا شريك له ونشهد أن سيدنا و مولانا محمداً عبده ورسوله أرسله إلى كافة الناس بشيراً ونذيراً وداعياً إلى الله بإذنه وسراجاً منيراً صلى الله تعالى عليه وعلى اٰله وأصحابه وبارك وسلم تسليماً كثيراً كثيراً.

أما بعد! فأعوذ بالله من الشيطٰن الرجيم ؕ بسم الله الرحمٰن الرحيم ؕ

اَلَمۡ تَرَ کَیۡفَ فَعَلَ رَبُّکَ بِاَصۡحٰبِ الۡفِیۡلِ ؕ﴿۱﴾ اَلَمۡ یَجۡعَلۡ کَیۡدَہُمۡ فِیۡ تَضۡلِیۡلٍ ۙ﴿۲﴾ وَّ اَرۡسَلَ عَلَیۡہِمۡ طَیۡرًا اَبَابِیۡلَ ۙ﴿۳﴾ تَرۡمِیۡہِمۡ بِحِجَارَۃٍ مِّنۡ سِجِّیۡلٍ ۪ۙ﴿۴﴾ فَجَعَلَہُمۡ کَعَصۡفٍ مَّاۡکُوۡلٍ ٪﴿۵﴾

وجہ تسمیہ:

یہ سورۂ فیل ہے۔ فیل عربی زبان میں ہاتھی کو کہا جاتا ہے۔ یہ اصل میں فارسی زبان میں لفظ پیل تھا، اور اسی کو عربی میں منتقل کیا گیا، تو ’’پ‘‘ کو ’’ف‘‘ سے بدل کر فیل ہوگیا۔ اہل

عرب بھی ہاتھی کو فیل ہی کہتے ہیں۔ اس سورت میں بھی ہاتھی والوں کا قصہ بیان کیا گیا ہے اس لیے اس کا نام سورۂ فیل ہے۔

عام الفیل:

اس سورت میں جو واقعہ بیان کیا گیا ہے، وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ولادت سے پہلے پیش آیا۔ ربیع الاول ۵۷۰ء میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ولادت ہوئی۔ اور یہ واقعہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ولادت سے ۵۰ یا ۵۵ ردن پہلے محرم میں پیش آیا۔ اسی لیے جہاں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ولادت کا تذکرہ کیا جاتا ہے، وہاں مؤرخین لکھتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ولادت باسعادت عام الفیل میں ہوئی۔

واقعۂ فیل:

واقعہ یہ ہے کہ یمن میں پہلے شاہانِ حِمْیَر کی حکومت تھی۔ ان کا سب سے آخری بادشاہ ذونواس تھا۔ یہ لوگ بت پرست تھے، اس زمانے میں یمن ہی میں کچھ لوگ نصرانی بھی تھے، حضرت عیسیٰ علی نبینا وعلیہ الصلاۃ والسلام پر ایمان رکھنے والے اور خدائے واحد کی عبادت کرنے والے تھے۔ یہ بادشاہ بت پرست تھا، لہٰذا اس نے اہل ایمان پر بڑے مظالم ڈھائے۔ اس نے ایک بہت بڑی، لمبی چوڑی خندق کھدوائی اور اس کو آگ سے بھر دیا، اور اس میں تقریباً بیس ہزار (۲۰۰۰۰) ان عیسائیوں کو- جو خدائے واحد کی عبادت کرنے والے تھے- ڈال کر ختم کر دیا۔ یہ اصحاب اخدود کا واقعہ ہے، جو قرآن کریم میں، سورۂ بروج میں ہے۔ اس میں سے دو آدمی کسی طرح بھاگ کر نکل گئے اور ملک شام پہنچے۔ وہاں قیصر روم کی حکومت تھی، اس حکومت سے انہوں نے ذونواس- جو شاہان حمیر میں سے ہے- کی شکایت

کی کہ اس نے نصاریٰ (خدائے واحد کی عبادت کرنے والوں) پر مظالم ڈھائے ہیں۔تو اس سے انتقام لیا جائے۔

یمن میں شاہِ حبشہ کی حکومت:

قیصر کے پاس جب شکایت پہنچی، تو قیصر نے حبشہ کے بادشاہ کو خط لکھا، وہ بھی نصرانی تھا اور یہ واقعہ چوں کہ یمن میں پیش آیا تھا، اور یمن حبشہ سے قریب ہے۔(بحر احمر کے شمال میں یمن ہے، جنوب میں براعظم افریقہ ہے، اور وہیں حبشہ (ایتھوپیا) واقع ہے)الغرض قیصر روم نے حبشہ کے بادشاہ کو خط لکھا کہ تم اُس سے انتقام لو۔ چناں چہ اس نے ایک عظیم الشان فوج اپنے دو کمانڈروں ارباط اور ابرہہ کی ماتحتی میں یمن بھیجی۔اور انہوں نے ایسا زوردار حملہ کیا کہ یمن کو ذونواس کی حکومت اور اس کے مظالم سے نجات دلائی۔ذونواس تو بھاگ گیا اور سمندر میں ڈوب گیا اور اس کی موت واقع ہوئی۔اور اب یمن میں شاہِ حبشہ کا جو لشکر آیا تھا اس کی حکومت قائم ہوئی۔

کنیسہ کی تعمیر:

بعد میں ان دونوں کمانڈروں میں بھی ایک دوسرے پر غلبہ حاصل کرنے لیے آپس میں مقابلہ ہوا، اس میں ابرہہ دوسرے پر غالب آیا، اور شاہِ حبشہ نے پھر اسی کو یمن میں اپنا گورنر مقرر کیا۔اس طرح شاہ حبشہ کا تسلط یمن میں ہوا۔ابرہہ چوں کہ نصرانی مذہب کا ماننے والا تھا اور بڑا پر جوش تھا، تو اس نے سوچا کہ میں ایک بہت بڑا کنیسہ تعمیر کروں۔ چناں چہ اپنی اس سوچ کے مطابق اس نے قُلَّیس نام کا ایک بڑا کنیسہ تعمیر کروایا۔اس کی اونچائی اتنی تھی کہ اگر کوئی آدمی اس کے نیچے کھڑا رہ کر دیکھے تو اس کی اونچائی تک اس کی نگاہ نہیں پہنچ سکتی

تھی۔اوراس کوسونے، چاندی اور جواہرات سے مرصع کیا،اور بہت شاندار بنایا۔اور بنانے کے بعداس نے لوگوں میں اعلان کیا کہ تم لوگ مکہ مکرمہ میں کعبہ کی زیارت اور حج کے لیے جاتے ہو،تو وہاں جانے کے بجائے یہاں آکرعبادت کیا کرو۔

ابرہہ کی قسم:

یمن کے عربوں میں اگر چہ بت پرستی رائج ہو چکی تھی؛لیکن دین ابراہیمی اور اسی طرح کعبۃ اللہ کی محبت ان کے مزاجوں میں پیوست تھی،تو یہ اعلان ان کو بہت گراں گزرا، اوران تمام قبائل میں جو عرب تھے: عدنان،قحطان،قریش تمام میں غم وغصہ کی ایک لہر پھیل گئی۔اوروہ اس کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔چناں چہ ان میں سے ایک آدمی اس کنیسہ میں جاکر پاخانہ کرکے آ گیا۔اور جب ابرہہ کو پتا چلاتو اس کو بہت غصہ آیا۔اور ایک قافلہ اس کنیسہ کے قریب ٹھہرا ہوا تھا،اس نے اپنی ضرورت کے لیے آگ جلائی تھی، پھر وہاں سے اس آگ کو جلتا ہوا چھوڑ کر روانہ ہوگیا،تو وہ آگ پھیلی اورکنیسہ کے کچھ حصے کو بھی جلا دیا،اور نقصان پہنچایا،تو ابرہہ کو اور زیادہ غصہ آیا۔اور اس نے قسم کھائی کہ جس کعبہ کے خاطر انہوں نے میرے کلیسا کے ساتھ یہ معاملہ کیا ہے میں اس کی اینٹ سے اینٹ بجادوں گا۔

کعبۃ اللہ کو ڈھانے کی پلاننگ:

چناں چہ اس نے ایک بہت بڑا لشکر تیار کیا اور کعبہ پر حملہ کرنے کے لیے پہلے تو اس نے شاہِ حبشہ سے اجازت مانگی۔تو شاہِ حبشہ نے صرف اجازت ہی نہیں دی؛ بلکہ اپنا ایک عظیم الشان اور بے نظیر ہاتھی،جس کا نام محمود تھا،وہ بھیجا کہ اس پر بیٹھ کر حملہ کرو،اور اس کے علاوہ بھی آٹھ بڑے بڑے ہاتھی بھیجے؛ تاکہ ان کے ذریعے کعبۃ اللہ کی عمارت کو ختم کرنے

میں مدد لی جاسکے۔ تجویز یہ تھی کہ کعبۃ اللہ کی عمارت جن ستونوں پر قائم ہے ان ستونوں کو لوہے کی زنجیروں سے باندھ کر ان زنجیروں کو ان ہاتھیوں کی گردنوں میں ڈالا جائے اور چلایا جائے؛ تاکہ پورا کعبہ -نعوذ باللہ- اکھڑ کر ختم ہو جائے۔ بہر حال! ساٹھ ہزار (٦٠٠٠٠) کی فوج اور ان ہاتھیوں کو لے کر کعبۃ اللہ کو ڈھانے کے لیے ابرہہ روانہ ہوا۔

درمیانی طاقتوں سے مقابلہ:

چوں کہ خود یمن میں بھی عرب آباد تھے، جن کے دلوں میں کعبۃ اللہ کی محبت پیوست تھی، وہ سب اس کے مقابلے کے لیے جمع ہوئے۔ اور ذونفر نامی ایک آدمی کی ماتحتی میں وہ ابرہہ کے لشکر کے مقابلے پر آئے؛ لیکن اس کو شکست ہوئی۔ اللہ تعالیٰ کو یہی منظور تھا کہ یہ آگے بڑھے، اور اس پر اللہ کا عذاب آئے۔ شکست ہوئی تو ابرہہ نے ذونفر کو قید کر لیا۔ ارادہ تو قتل کا تھا؛ لیکن اس نے کہا: مجھے قتل مت کرو، ہو سکتا ہے تمہارے کام آؤں۔ تو اس نے زنجیروں میں قید کر کے اپنے ساتھ رکھا۔ پھر آگے بڑھا اور قبیلۂ خَشعم کے علاقے سے جب گزر ہوا تو قبیلۂ خَشعم کے سردار نُفیل بن حبیب نے بھی اپنے قبیلے کی دونوں شاخوں کے نوجوان لڑاکوؤں کے ذریعے اس کا مقابلہ کیا؛ لیکن ان کو بھی شکست ہوئی۔ اور نفیل بن حبیب کو بھی ابرہہ نے قید کر کے اپنے ساتھ لے لیا۔

اہلِ طائف کی رہنمائی:

اب یہ لشکر آگے بڑھا اور جب طائف کے پاس پہنچا تو طائف والوں کو پہلے سے ہی معلوم ہو چکا تھا کہ اس کے مقابلے میں جو لوگ آئے ہیں، انہوں نے شکست کھائی ہے۔ تو انھوں نے اپنی خیر اسی میں سمجھی کہ مقابلے پر نہ آئیں۔ اس لیے کہ طائف والوں کا بت

لات تھا، وہ اس کی پوجا کرتے تھے، اورانہوں نے اس کی ایک مستقل عبادت گاہ بنا رکھی تھی، ان کو یہ ڈر تھا کہ اگر ہم مقابلے پر آئیں گے، تو ہمارے لات کی عبادت گاہ کو ابرہہ اجاڑ دے گا۔ توانہوں نے مقابلے کے بجائے اس کے ساتھ مقابلہ نہ کرنا طے کیا؛ بلکہ جب وہ ان کے قریب سے گزرا تو انہوں نے کہا کہ ہم تمہارا مقابلہ نہیں کریں گے ؛ بلکہ تمہارا تعاون کریں گے۔ ہم اپنے ایک سردار ابو رغال کو تمہارے ساتھ بھیجتے ہیں تا کہ وہ راستہ بھی بتلائے۔ چناں چہ اس کو بھیجا۔ پھر اسی کی رہنمائی میں یہ لوگ آگے بڑھے۔

اونٹوں پر قبضہ:

پھر مکہ کے قریب مُغَمَّس نامی مقام پر ابرہہ نے پڑاؤ ڈالا۔ وہاں لشکر ٹھہرا ہوا تھا اور وہیں قریب میں مکہ والوں کے اونٹ چرا کرتے تھے، تو لشکر نے مکہ والوں کے تمام اونٹوں پر قبضہ کیا۔ اس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دادا حضرت عبد المطلب کے دوسو (۲۰۰) اونٹ بھی تھے۔ ان سب اونٹوں پر انہوں نے قبضہ کیا۔ اس کے بعد قبیلۂ حمیر کا حناطہ نامی ایک آدمی اس کے ساتھ تھا، اس کے ساتھ ابرہہ نے مکہ والوں کو پیغام بھیجا کہ دیکھو! میں تو کعبہ کی عمارت کو ختم کرنے کے لیے آیا ہوں، اگر تم میرا مقابلہ نہیں کرو گے، تو میں تم کو نہیں چھیڑوں گا، کوئی تعرض نہیں کروں گا۔ چناں چہ جب وہ یہ پیغام لے کر مکہ مکرمہ لوگوں کے پاس پہنچا، تو مکہ والوں نے کہا کہ سردار عبد المطلب ہیں، ان سے ملو۔

وہ آپ کو نہیں چھوڑے گا:

جب وہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دادا عبد المطلب سے ملا، تو عبد المطلب نے کہا کہ بھائی! یہ تو اللہ کا گھر ہے، جس کا گھر ہے وہ اس کی حفاظت کرے گا۔ اللہ اس کو چھوڑ نہیں سکتا۔ تم اس کو

میری بات پہنچادو۔تو حناطہ نے کہا کہ میں آپ کی اس کے ساتھ ملاقات کروادیتا ہوں، آپ خوداس سے بات کر لیجیے۔ چناں چہ جب حناطہ عبدالمطلب کوابرہہ کے پاس لے گیا۔تو جب وہ وہاں پہنچے تو ابرہہ تخت پر بیٹھا ہوا تھا۔اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضرت عبدالمطلب کوقداونچا اور چہرہ بھی وجیہ عطا فرمایا تھا۔ان کی وجاہت اور رعب کو دیکھ کرابرہہ اپنے تخت سے نیچے اتر آیا،اور نیچے بیٹھا،اور عبدالمطلب کوبھی اپنے ساتھ بٹھایا۔ابرہہ نے پوچھا کہ کیا ہے آپ کی بات؟ عبدالمطلب نے کہا کہ میرے دوسو(۲۰۰) اونٹ پرآپ کے لشکر نے قبضہ کرلیا ہے،ان کو چھوڑ دیجیے۔تو ابرہہ کہنے لگا کہ آپ کو دیکھ کرآپ کی عظمت اور بڑائی میرے دل میں قائم ہوئی تھی؛لیکن آپ کی یہ بات سن کرسب ختم ہوگئی۔میں تو یوں سمجھتا تھا کہ یہ کعبہ جس کو میں ڈھانے کے لیے آیا ہوں، جوتمہارے دین کی بنیاد ہے،تم مجھ سے اس کے متعلق درخواست کروگے کہ ایسا مت کرو۔اس کے بجائے تم نے تو اپنے اونٹوں کے چھڑانے کی درخواست کی۔تو حضرت عبدالمطلب نے جواب میں کہا: میں اونٹوں کا مالک ہوں، مجھے اپنے اونٹوں کی فکر ہے،اس لیے میں نے یہ درخواست کی۔اورجس گھر کوتم اجاڑنے کے لیے آئے ہو،اس کا ایک مالک ہے،وہ اس کی حفاظت کرے گا،ہمیں اس کی ضرورت نہیں ہے، اورہم بھی تمہارامقابلہ نہیں کرسکتے؛ کیوں کہ ہمارے پاس اتنے اسباب اورطاقت نہیں ہے۔ لیکن یادرکھو!وہ آپ کوچھوڑے گا نہیں۔

عبدالمطلب کی دعا:

خیر! یہ بات کرکے عبدالمطلب وہاں سے واپس آئے،اورقریش کے کچھ سردارقسم کے لوگوں کوساتھ لے کر کعبۃ اللہ پر پہنچے،اوراس کے دروازے کا کڑا پکڑکر اللہ تبارک و

تعالیٰ سے دعا کی: اے اللہ! ہر آدمی اپنے گھر کی حفاظت کرتا ہے، تو اپنے گھر کی حفاظت فرما، یہ صلیب اور اس کی طاقت تیری طاقت پر غالب نہ آنے پائے۔ یہ دعا کر کے انہوں نے لوگوں سے کہا کہ یہاں سے ہٹ جاؤ، اور پہاڑوں اور وادیوں میں چلے جاؤ، کہیں ایسا نہ ہو کہ ان پر کوئی عذاب آئے اور ہم بھی اس میں پھنس جائیں۔ بہر حال! یہ لوگ وہاں سے پہاڑ پر چلے گئے، اور اس انتظار میں رہے کہ ابرہہ کیا کرتا ہے؟

ہاتھی کے کان میں کیا کہا......؟؟؟

دوسرے دن ابرہہ نے اپنے لشکر کو تیار کیا، صف بندی کی اور سب سے پہلے محمود ہاتھی کو اٹھانا چاہا۔ نفیل بن حبیب - جو اس کے ساتھ تھے - نے جا کر اس ہاتھی کے کان میں کہا کہ تو اللہ کے حرم میں ہے!!! چناں چہ اس ہاتھی کو اٹھانا چاہا، نہیں اٹھا۔ بڑی مشکل سے آنکڑے اس کے کانوں میں ڈالے، تبر مارے، تب اٹھا، اس کو کعبۃ اللہ کی طرف چلانا چاہتے، تو نہیں چلتا تھا۔ یمن کی طرف چلانا چاہتے، تو چلتا تھا۔ شام کی طرف چلانا چاہتے، تو چلتا تھا۔ مشرق کی طرف چلانا چاہتے، تو چلتا تھا؛ لیکن مغرب کی طرف کعبۃ اللہ تھا، اس طرف جب چلانے کی نوبت آتی، تو نہیں چلتا تھا۔

خدائی لشکر:

اسی دوران سمندر کی طرف سے پرندوں کے غول درغول آتے ہوئے دکھائی دیے۔ ان میں سے ہر پرندے کی چونچ میں ایک کنکری اور اس کے دونوں پنجوں میں چنے یا مسور کے برابر ایک ایک کنکری تھی، اس طرح ہر پرندے کے پاس تین کنکریاں تھیں۔ انہوں نے آ کر لشکر پر یہ کنکریاں برسائیں۔ جس کے سر پر پڑتی تھیں، ایسا معلوم ہوتا تھا رِیوالور

(revolver) کی گولی ہے، سیدھی پورے جسم کو پھاڑ کر نیچے زمین میں چلی جاتی تھی بہت سے وہیں ختم ہوگئے، بہت سے تو وہاں سے بھاگے؛ لیکن ان گولیوں کے اثر کی وجہ سے ان کے جسم میں چیچک کی طرح بڑے بڑے پھوڑے نکل آئے۔

ابرہہ کا عبرت ناک انجام:

خود ابرہہ کے جسم میں بھی یہی کیفیت پیدا ہوگئی؛ البتہ وہ وہاں مرا نہیں۔ اللہ تعالیٰ اسے قابل عبرت بنانا چاہتے تھے۔ کیوں کہ سب یہاں مرجاتے تو یمن والوں کو پتا کیسے چلتا کہ ان کے ساتھ یہ معاملہ ہوا؟ تو کچھ تو یہاں مرے، کچھ بھاگ کر یمن کی طرف گئے۔ اور راستے میں خود ابرہہ کی انگلیاں کٹ کٹ کر پیپ سے بہہ رہی تھیں، اسی حالت میں وہ یمن پہنچا۔ اور یمن پہنچ کر اس کا سینہ پھٹ گیا، اور اس کا پورا جسم پیپ سے بہہ کر ختم ہوگیا۔ لوگوں نے اس کا یہ عبرت ناک انجام دیکھا، دوسرے لوگ بھی اسی طرح مرے۔ اور اس ہاتھی کو سنبھالنے والے دو پیل بان وہیں مکہ مکرمہ میں اندھے اور اپاہج بن گئے۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ میں نے بھی ان دونوں کو مکہ میں دیکھا ہے۔ وہ مکہ ہی میں تھے، بھیک مانگتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اسی واقعے کو اس سورت میں بیان فرمایا ہے۔[۱]

ارہاص؛ نہ کہ معجزہ:

اس واقعے کو حضرات محدثین نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا معجزہ قرار دیا ہے؛ لیکن معجزہ کی جو اصطلاحی تعریف کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ کوئی شخص اپنے نبی ہونے کا دعویٰ کرے، اور اپنی

---

(۱) السيرة النبوية لابن إسحاق: ۳۶- ۵۲ و ۱۱۳ - ۱۱۵ (ط: دار الكتب العلمية، بيروت، لبنان) و تفسير الطبري، سورة الفيل، نقلاً عن ابن إسحاق.

نبوت کی دلیل اور علامت کے طور پر جو چیز خرق عادت پیش کرے، اس کو معجزہ کہا جاتا ہے۔

بخاری شریف میں بھی نبیٔ کریم ﷺ کا ارشاد ہے: مامن الأنبياء نبي إلا أعطي ما مثله أمن عليه البشر. (ہر نبی کو اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے ایسی نشانی دی جاتی ہے جس کو دیکھ کر لوگ اس نبی پر ایمان لاتے ہیں)[1] تو اسی کو معجزہ کہا جاتا ہے۔ اور جب یہ واقعہ پیش آیا، اس وقت نبیٔ کریم ﷺ کی ولادت بھی نہیں ہوئی تھی۔ اس لیے اس کو معجزہ کا نام دینا تو ٹھیک نہیں ہے۔ ہاں! اس کو ارہاص کہا گیا ہے۔ یعنی کسی نبی کی ولادت سے پہلے یا اس کی ولادت کے بعد نبوت ملنے سے پہلے کچھ ایسی چیزیں، علامات، نشانیاں جو معجزہ جیسی ہوں، ان سے ظاہر ہوں، تو اس کو معجزہ نہیں کہا جاتا؛ بلکہ ارہاص کہا جاتا ہے۔ جیسے: نبیٔ کریم ﷺ کی ولادت ہوئی، تو کسریٰ کے محل کے کنگرے گر گئے تھے، اور آتش پرستوں کے عبادت خانے میں وہ آگ جو سالہا سال سے نہیں بجھی تھی، وہ بجھ گئی تھی۔ یہ سب ارہاصات کہلاتے ہیں۔ تو اس (ہاتھی والے قصے) کو بھی ارہاص سے تعبیر کیا گیا ہے۔

بہر حال! اس واقعے کو اس سورت میں بیان کر کے قریش پر اللہ تبارک وتعالیٰ نے جو انعام فرمایا، اس کو بیان کیا جارہا ہے کہ دیکھو! جو کعبۃ اللہ کو برباد کرنے کے لیے آیا تھا، اس کو ہم نے اس طرح ٹھکانے لگایا اور اس طرح ہم نے تمہاری حفاظت کی۔

دفعِ مضرت اور جلبِ منفعت:

چناں چہ اس واقعے کے بعد پورے ملک حجاز اور اطراف میں قریش کی دھاک بیٹھ گئی۔ اور لوگ کہنے لگے کہ یہ تو اللہ والے ہیں، ان کو چھیڑا نہیں جا سکتا۔ جو بھی ان کے

---

(۱) صحيح البخاري: ۴۹۸۱.

مقابلے پر آئے گا وہ برباد ہوگا۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ ان کے قافلے سال میں دو مرتبہ - گرمی کے زمانے میں شام، اور سردی کے زمانے میں یمن کی طرف - تجارت کے لیے ایسے علاقوں میں جاتے تھے جہاں کوئی محفوظ نہیں رہ سکتا تھا، کوئی ان کے ان تجارتی قافلوں کو چھیڑتا نہیں تھا۔ اسی نعمت کو اللہ تعالیٰ نے سورۂ قریش میں بیان کیا ہے، جو آپ سن چکے ہیں۔ اس سورت میں چوں کہ دفعِ مضرت ہے، اس لیے اس کو پہلے بیان کیا اور سورۂ قریش میں جلبِ منفعت ہے، اس لیے اس کو سورۂ قریش میں بیان کیا گیا ہے۔

ترجمہ و وضاحت:

باری تعالیٰ فرماتے ہیں:

اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِاَصْحٰبِ الْفِيْلِ

(کیا تم نے نہیں دیکھا کہ تمہارے پروردگار نے ہاتھی والوں کے ساتھ کیا معاملہ کیا؟)

اَلَمْ يَجْعَلْ كَيْدَهُمْ فِيْ تَضْلِيْلٍ

(کیا اللہ تعالیٰ نے اُن لوگوں کی ساری تدبیریں بیکار نہیں کر دیں؟)

وَّ اَرْسَلَ عَلَيْهِمْ طَيْرًا اَبَابِيْلَ

(اور ان پر اللہ تعالیٰ نے غول کے غول پرندے بھیجے)

ابابیل یا تو یہ اسم جمع ہے، اور بعض کہتے ہیں کہ یہ اُبُّول کی جمع ہے، اُبُّول پرندوں کے غول (جھنڈ) کو کہا جاتا ہے۔ ہمارے یہاں ایک پرندہ ہوتا ہے، اس کو لوگ ابابیل کہتے ہیں، وہ یہاں مراد نہیں ہے۔ تمام مفسرین نے اس کی تصریح کی ہے۔

تَرْمِيْهِمْ بِحِجَارَةٍ مِّنْ سِجِّيْلٍ

(وہ (پرندے) ان کے اوپر مٹی کے پتھر پھینک رہے تھے)

سجیل اصل میں فارسی لفظ ہے، سنگ اور گِل کے مجموعے سے بنا ہے۔ مٹی کا گارا بنا کر اس کی گولیاں بنائی جائیں، اور ان گولیوں کو آگ میں پکایا جائے، تو وہ پتھر جیسی مضبوط ہوجاتی ہیں۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے اس کا ترجمہ ''کنکر کی پتھریاں'' کیا ہے۔[1]

فَجَعَلَهُمْ كَعَصْفٍ مَّأْكُوْلٍ

(چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس کو ایسا بنادیا جیسے کھایا ہوا بھوسا)

کھیت میں سے جب کھیتی کاٹ لی جاتی ہے، تو کھیتی کٹ چکنے کے بعد کھیت میں کھیتی کے کٹے ہوئے ذرات کو بھوسا کہتے ہیں۔ اس بھوسے کو جانور کھالیں، پھر کھانے کے بعد جانور جگالی (વાગોળવું) کرتا ہے، وہ باہر نکالتا ہے تو بالکل نرم اور قابل نفرت ہوتا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ نے ان کو ایسا بنادیا۔

(۱) تفسیر عزیزی، سورۂ فیل۔

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

سورۂ ہُمَزَہ

(مؤرخہ: ۱۸/صفر المظفر ۱۴۴۰ھ مطابق ۲۷/اکتوبر ۲۰۱۸ء، شبِ یک شنبہ)

الحمد لله نحمده ونستعينه ونستغفره ونؤمن به ونتوكل عليه ونعوذ بالله من شرور أنفسنا ومن سيئات أعمالنا ونعوذ بالله من شرور أنفسنا ومن سيئات أعمالنا من يهده الله فلا مضل له ومن يضلله فلا هادي له ونشهد أن لا إلٰه إلا الله وحده لا شريك له ونشهد أن سيدنا و مولانا محمداً عبده ورسوله أرسله إلى كافة الناس بشيراً ونذيراً وداعياً إلى الله بإذنه وسراجاً منيراً صلى الله تعالى عليه وعلى اٰله وأصحابه وبارك وسلم تسليماً كثيراً كثيراً.

أما بعد! فأعوذ بالله من الشيطٰن الرجيم ○ بسم الله الرحمٰن الرحيم ○

وَيۡلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةِۣ ﴿١﴾ الَّذِىۡ جَمَعَ مَالًا وَّعَدَّدَهٗ ﴿٢﴾ يَحۡسَبُ اَنَّ مَالَهٗۤ اَخۡلَدَهٗ ﴿٣﴾ كَلَّا لَيُنۡۢبَذَنَّ فِى الۡحُطَمَةِ ﴿٤﴾ وَمَاۤ اَدۡرٰٮكَ مَا الۡحُطَمَةُ ﴿٥﴾ نَارُ اللّٰهِ الۡمُوۡقَدَةُ ﴿٦﴾ الَّتِىۡ تَطَّلِعُ عَلَى الۡاَفۡـِٕدَةِ ﴿٧﴾ اِنَّهَا عَلَيۡهِمۡ مُّؤۡصَدَةٌ ﴿٨﴾ فِىۡ عَمَدٍ مُّمَدَّدَةٍ ﴿٩﴾

وجہ تسمیہ:

یہ سورۂ همزة ہے۔ چوں کہ اس کی پہلی آیت میں لفظ همزة آیا ہے، اس مناسبت سے اس کا نام سورۂ ہمزہ رکھا گیا۔

شانِ نزول:

اس سورت کے شانِ نزول کے سلسلے میں مذکور ہے کہ نبی کریم ﷺ نے جب لوگوں کو اسلام کی دعوت دینا شروع کیا اور رفتہ رفتہ لوگ آپ ﷺ پر ایمان لانے لگے اور ایمان والوں کا حلقہ آہستہ آہستہ بڑھنے لگا، تو مکہ کے سردار قسم کے لوگوں نے محسوس کیا کہ اگر اس طرح اِن کے ماننے والوں کی تعداد دن بہ دن بڑھتی جائے گی، تو ہماری چودھراہٹ اور ہماری ریاست خطرے میں پڑ جائے گی، چناں چہ جب انہوں نے خطرہ محسوس کیا، تو حسد، عداوت اور بغض کی وجہ سے نبی کریم ﷺ کی غیبت اور آپ ﷺ پر طعن وتشنیع شروع کر دی۔ وہ اپنی مجلسوں میں غائبانہ نبی کریم ﷺ اور مسلمانوں کی برائیاں کرتے تھے، اور باقاعدہ اس کا پروپیگنڈہ شروع کیا۔ اور بسا اوقات ان میں سے بعض تو روبہ رو نبی کریم ﷺ کو اور مسلمانوں کو طعن وتشنیع کرتے تھے۔ اور اس کو انہوں نے اپنا مشغلہ اور مِشن بنالیا تھا۔

بعض لوگوں کے نام بھی مختلف روایات میں وارد ہوئے ہیں مثلاً: اَخنَس بن شریق ولید بن مُغیرہ، امیہ بن خلف، جمیل بن عامر جمحی اور ابی بن خلف۔ یہی مکہ مکرمہ کے سردار قسم کے لوگ تھے۔ اور یہی لوگ حضور ﷺ اور مسلمانوں کی برائیاں (پیٹھ پیچھے اور سامنے) اور طعن وتشنیع کرنے سے باز نہیں آتے تھے۔ اس پر تسلی کے لیے اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ پر یہ سورت نازل فرمائی۔[۱]

اس سورت میں کسی کا نام نہیں لیا گیا، بلکہ ان کی برائیوں اور کرتوت کو ذکر کیا گیا ہے۔ اس میں ایک مصلحت یہ بھی ہے کہ جو لوگ بھی ایسے کرتوتوں کے مرتکب ہوں گے، اُن

(۱) تفسير الطبري وبحر العلوم للسمرقندي ومعالم التنزيل للبغوي.

کے لیے وہی وعیدیں ہیں، جو اِن کے لیے اِس سورت میں بیان کی گئی ہیں۔

العبرة لعموم اللفظ:

حضرات اصولیین کا قاعدہ ہے کہ کوئی آیت کسی خاص شخصیت کے سلسلے میں، اس کے کسی خاص عمل کی وجہ سے نازل ہوئی، تو وہ اُسی کے ساتھ مخصوص نہیں ہوتی؛ بلکہ اس قسم کی حرکت جو بھی کرے گا، وہ اس میں شمار کیا جائے گا۔ یہاں بھی ایک عمومی انداز اختیار کیا گیا ہے۔ اُن کے اِن کرتوتوں اور ایذا رسانیوں کی وجہ سے نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور مسلمانوں کو بہت تکلیف پہنچتی تھی۔ قرآن پاک میں دوسری جگہ پر باری تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّكَ يَضِيْقُ صَدْرُكَ بِمَا يَقُوْلُوْنَ ﴿٩٧﴾ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَكُنْ مِّنَ السّٰجِدِيْنَ ﴿٩٨﴾ وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَاْتِيَكَ الْيَقِيْنُ ﴿٩٩﴾ (الحجر) (اے نبی! ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ اُن کی باتوں سے آپ کا دل تنگ ہوتا ہے، لیکن [ہم آپ کو یہ تاکید کرتے ہیں کہ] آپ اپنے رب کی پاکی حمد وثنا کے ساتھ بیان کیجیے اور اللہ کے حضور سجدہ ریز ہونے والے بنیے، اور اللہ کی عبادت میں لگے رہیے موت تک) گویا ان کے ان طعنوں، غیبت اور شرارتوں کا کوئی جواب دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ دیگر مقامات پر بھی ان چیزوں کو بیان کیا گیا ہے۔ اور یہی تلقین کی گئی ہے کہ صبر اور تقویٰ سے کام لیا جائے۔ یہاں اس سورت میں ان کی ان ہی حرکتوں کو ذکر فرما کر اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے وعید سنائی گئی ہے۔

ھمزة اور لمزة کی تحقیق:

وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةِۨ

ھمزة اور لمزة دونوں فُعَلَةٌ کے وزن پر ہیں، یہ مبالغے کے صیغے ہیں، ھمزة: یعنی

بڑی خرابی ہے اس آدمی کے لیے جو پیٹھ کے پیچھے دوسروں پر عیب لگانے والا ہے۔ لمزۃ: منہ پر طعنہ دینے کے عادی کو کہتے ہیں۔[۱] بعض حضرات مفسرین اور اہل لغت نے اس کے برعکس بھی ترجمہ کیا ہے۔ یعنی ھمزۃ کا ترجمہ طعنہ دینے والا اور لمزۃ کا ترجمہ پیٹھ پیچھے برائی کرنے والا۔ صاحب تفسیر قرطبی نے یہ دونوں چیزیں بیان کی ہیں۔[۲] لیکن عام طور پر ہمارے اکابر جو اردو میں ترجمہ کرتے ہیں وہ اسی کو اختیار کرتے ہیں کہ ھمزۃ: غائبانہ دوسروں پر عیب لگانے والا، اور لمزۃ: منہ پر طعنے دینے کا عادی۔

اس کو اپنے مال پر اعتماد ہے:

ویل بہت بڑی خرابی، ہلاکت اور بربادی کو کہتے ہیں۔ گویا اِس سے ہر اُس آدمی کو بہت بڑی بربادی اور ہلاکت کی وعید سنائی گئی، جو لوگوں کو تکالیف پہنچاتا ہے اور پیٹھ پیچھے عیب لگاتا ہے، اور منہ زبانی طعن وتشنیع کرتا ہے۔

الَّذِیْ جَمَعَ مَالًا وَّعَدَّدَہٗ. (جس نے مال اکٹھا کیا اور گن گن کر رکھا)

ان دونوں باتوں کے ذکر کرنے کی وجہ کیا ہے؟ وہ بھی بتلائی۔ اس لیے کہ دراصل اس نے مال جمع کر رکھا ہے، اور اس سے محبت ہے۔ اور اس کو اپنے مال پر اس قدر اعتماد ہے کہ وہ یوں سمجھتا ہے کہ میری مال کی فراوانی اور دولت کی وجہ سے کوئی میرا کچھ بگاڑ نہیں سکتا۔ اس لیے وہ ایسی حرکتیں کرتا ہے۔

---

(۱) نقله الطبري عن مجاهد.

(۲) نقله الطبري عن مجاهد قبله.

تین برائیاں:

الحاصل !اس سورت میں تین برائیوں کی طرف خاص طور سے تنبیہ کی گئی ہے:

(۱)غائبانہ اُن لوگوں پر عیب لگانا جو بُری ہیں۔ یہ کہہ کر گویا مسلمانوں کو بھی متنبہ کیا جارہا ہے کہ اپنے آپ کو ایسے کرتوتوں اور حرکتوں سے باز رکھو، ورنہ یہی وعید تم پر بھی صادق آسکتی ہے۔

(۲) گن گن کر رکھتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مال کو خرچ نہیں کرتا ہے۔

(۳)اس میں لالچ اور حرص ہے، اس کی وجہ سے مال جمع کرتا ہے۔ اور بخل کی وجہ سے گن گن کر رکھتا ہے، خرچ نہیں کرتا ہے۔

مال کے ذریعے بھی اللہ کا قرب:

کوئی آدمی شریعت کے بتائے ہوئے اصولوں کے مطابق، جائز طریقے سے مال کمائے، اور اللہ تعالیٰ نے جہاں خرچ کرنے کا حکم دیا ہے وہاں خرچ کرے، بخل سے کام نہ لے، مالی حقوق کی ادائیگی میں کوئی کوتاہی نہ کرے، تو کوئی حرج نہیں۔ مال بھی اللہ کی ایک نعمت ہے، اس کے ذریعے سے آدمی اللہ کا قرب حاصل کرسکتا ہے۔

اللہ کی جلائی ہوئی آگ:

يَحۡسَبُ اَنَّ مَالَهٗۤ اَخۡلَدَهٗ ۚ.(وہ یہ سمجھتا ہے کہ اس کا مال اس کو ہمیشہ زندہ رکھے گا)

گویا اس کو اپنے مال پر اتنا اعتماد ہے کہ وہ یوں سمجھتا ہے کہ اس مال کی وجہ سے میں ہمیشہ رہوں گا، یہ مال مجھے ہمیشہ زندہ رکھے گا۔ حالاں کہ اس دنیا میں کون ہمیشہ زندہ رہنے

کے لیے آیا ہے؟ یہ دنیا ہی باقی رہنے والی نہیں ہے!!! كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ. (الرحمٰن:۲۶) ہر ایک کو دنیا سے جانا ہے۔

یہاں تک اللہ تعالیٰ نے ان کی عادتیں اور خصلتیں بتلائیں۔ آگے وعید سنائی جارہی ہے۔ ویل کہہ کر وعید سنائی تھی۔ اب مزید سنائی جارہی ہے۔

كَلَّا لَيُنْبَذَنَّ فِي الْحُطَمَةِ. (ہرگز نہیں! اس کو تو ایسی جگہ میں ڈالا جائے گا جو اس کو چورا چورا کردے گی)

حَطَمَ يَحْطِمُ کے معنیٰ ہیں کسی چیز کو توڑ پھوڑ کر چورا بنا دینا۔ تو جہنم میں آگ کا ایک طبقہ ہے، اس طبقے کا نام حطمة ہے، اس کو اس میں ڈالا جائے گا، جو اس کے جسم کو توڑ پھوڑ کر چورا چورا کردے گا۔

وَ مَآ أَدْرٰكَ مَا الْحُطَمَةُ (اور تمہیں کیا معلوم کہ وہ چورا چورا کرنے والی چیز کیا ہے؟) یعنی جس جگہ میں اس کو ڈالا جائے گا، جو چورا چورا کرنے والی اور توڑ پھوڑ کرنے والی ہے، وہ کیا ہے؟ اللہ تعالیٰ آگے اس کی وضاحت فرماتے ہیں۔

نَارُ اللّٰهِ الْمُوْقَدَةُ. (اللہ کی جلائی ہوئی آگ ہے)

الَّتِيْ تَطَّلِعُ عَلَى الْأَفْـِٕدَةِ. (جو دلوں پر غالب آجاتی ہے)

دلوں کو جلانے والی آگ:

دیکھو! دنیا میں اگر کسی آدمی کو آگ میں ڈالا جائے، تو پہلے آگ اس کی کھال پر اثر کرتی ہے، پھر اس کے بعد گوشت، پھر ہڈی پر۔ اور عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ اسی میں آدمی کی موت واقع ہوجاتی ہے، اور دل تک اس کا اثر پہنچنے کی نوبت نہیں آتی۔ لیکن جب جہنمیوں

کو جہنم میں ڈالا جائے گا، تو جہنم میں لَا يَمُوْتُ فِيْهَا وَلَا يَحْيٰى۔ (الاعلیٰ:۱۳) (وہ نہ تو مرے گا، نہ زندہ رہے گا) یعنی وہ زندگی، زندگی نہیں ہے۔ موت نہیں آئے گی۔ جب موت نہیں آئے گی، تو دنیا میں تو آگ کا اثر دل تک پہنچے اس سے پہلے موت آجاتی ہے اس لیے وہ اثر نہیں پہنچ پاتا؛ لیکن جہنم میں تو دل پر بھی اثر پہنچے گا۔ لہٰذا وہ اس کے لیے بہت زیادہ تکلیف دہ ہوگی۔

چار گرمیاں:

حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب دہلویؒ فرماتے ہیں کہ دنیا میں ایک تو آگ کی گرمی ہوتی ہے، جس کی کیفیت تو سب جانتے ہیں۔ دوسری سورج کی گرمی ہوتی ہے۔ گرمی کے زمانے میں سورج جب قریب آتا ہے، اس کی وجہ سے لوگوں کو کتنی تکلیف محسوس ہوتی ہے؟ لوگ اے سی (A.C.) میں رہنا پسند کرتے ہیں۔ اور تیسری گرمی آدمی کے اندر کی ہوتی ہے۔ آدمی کو جب بخار آتا ہے تو اس کے جسم کی گرمی ہوتی ہے۔ تو بخار کی گرمی کی وجہ سے آدمی بہت زیادہ تکلیف محسوس کرتا ہے۔ بخار اندر ہی اندر ہے، اس لیے اس کو تکلیف کا شدت سے احساس ہوتا ہے۔ البتہ بخار مسامات کے ذریعے، پسینے کی شکل میں باہر نکل جائے تو کچھ چین وسکون محسوس ہوتا ہے۔ یہ تین قسم کی گرمیاں ہیں جس کو لوگ جانتے ہیں۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہاں چوتھی قسم کی گرمی بیان کی ہے، وہ اللہ کی جلائی ہوئی آگ ہے۔ تو جس گرمی سے لوگ دنیا میں واقف نہیں ہیں۔ اسی کو فرمایا جارہا ہے: نَارُ اللّٰهِ الْمُوْقَدَةُ (اللہ کی جلائی ہوئی آگ) الَّتِيْ تَطَّلِعُ عَلَى الْاَفْـِٕدَةِ (جو دل کے اندر تک جا پہنچے گی)[1]

---

(۱) تفسیر عزیزی: ۲۰۲۴۲ (کتب خانہ فیض ابرار، انکلیشور، گجرات)۔

ناقابل برداشت آگ:

اِنَّهَا عَلَيْهِمْ مُّؤْصَدَةٌ (بے شک وہ ان پر بند کردی جائے گی)۔

آگ اگر کھلی ہو تو اس کا اثر دھیرے دھیرے کم ہوجاتا ہے؛ لیکن اگر آگ کو بند کر دیا جائے، تو اس صورت میں اس کی شدت اور تاثیر مزید تیز ہوجاتی ہے۔ گویا آگ کو باہر نکلنے کا موقع نہیں دیا جائے گا۔ جیسے کسی بند ڈبے میں رکھا جائے۔

فِيْ عَمَدٍ مُّمَدَّدَةٍ (وہ آگ کے لمبے لمبے ستونوں میں گھرے ہوئے ہوں گے)

یعنی جہنم میں آگ کے ایسے لمبے شعلے ہوں گے، جو چاروں طرف سے ایسے معلوم ہوں گے جیسے ان کو آگ کے ستونوں میں بند کردیا گیا ہو۔ تو اس آگ کی شدت ناقابل برداشت ہوگی۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان کو یہ وعیدیں سنائیں۔

ایک وقت آئے گا:

حاصل یہ ہے کہ جو لوگ ایسی حرکتیں کرتے ہیں، اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے ان کو بتلا دیا گیا ہے کہ آج وہ اپنے مال ودولت کی فراوانی کی وجہ سے، اور اپنے روپیے پیسے پر اترانے کی وجہ سے یوں سمجھتے ہیں کہ کون ہمارا کچھ بگاڑ سکتا ہے؟ لیکن ایک وقت آئے گا کہ موت آئے گی اور پھر اللہ تعالیٰ ان کو جہنم کے اس طبقے میں ڈالیں گے، جہاں ان پر یہ عذاب سختی کے ساتھ مسلط کردیا جائے گا۔ بہر حال! نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ جن لوگوں نے اس طرح کا معاملہ کیا تھا ان کے لیے یہ وعیدیں ہیں۔

آج بھی ایسے لوگ ہیں......!!!

اور یہ اُسی زمانے کے ساتھ خاص نہیں ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب تک دنیا میں رہے،

آپ ﷺ کے ساتھ اس طرح کا معاملہ ہوا۔ آپ ﷺ کے دنیا سے تشریف لے جانے کے بعد آج بھی دنیا میں بڑی تعداد ایسے لوگوں کی ہے جو-نعوذ باللہ- نبیٔ کریم ﷺ کی شان میں گستاخیاں کرتے ہیں، آپ ﷺ پر عیب لگاتے ہیں، آپ ﷺ کو طعنے دیتے ہیں۔ تو یہ بات اسی زمانہ کے ساتھ خاص نہیں تھی۔ آج بھی لوگ ایسا کرتے ہیں۔ جیسے ایک شخص نے ساری دنیا کے کارٹون بنانے والوں کو-نعوذ باللہ- دعوت دی تھی، کہ فیس بک پر نبیٔ کریم ﷺ کے کارٹون بنائے جائیں، اور اس کے لیے بہت بڑا انعام بھی رکھا۔ نبیٔ کریم ﷺ کے ساتھ توہین کے اس معاملے پر ان لوگوں کے لیے بھی یہی وعید ہے۔ کہ دنیا میں ایسے کم بخت رذیل اور کمینے لوگ ہیں کہ جو دلیل سے بات نہیں کرتے، جب ان کے پاس کوئی دلیل نہیں ہوتی، تو وہ اس طرح سب وشتم، گالی گلوچ اور برائی پر اتر آتے ہیں۔ دنیا کا دستور یہی ہے کہ جب کسی کے پاس دلیل نہیں ہوا کرتی، تو وہ دوسرے طریقے اور ہتھکنڈے اپناتا ہے۔ یہاں بھی اسی طرح ہو رہا ہے کہ جو اپنے آپ کو جدید تہذیب کے دعوے دار کہتے ہیں، حقوق انسانی کے علَم بردار کہتے ہیں وہ بھی -نعوذ باللہ- نبیٔ کریم ﷺ کی شان میں اسی طرح گستاخیاں اور برائیاں کرتے ہیں۔ اور اس کے لیے لوگوں کو باقاعدہ دعوت دی جارہی ہے، ان کے لیے یہ سب وعیدیں ہیں۔

اہل ایمان کی آزمائش:

اس میں خود اہل ایمان کے ایمان کی بھی بڑی آزمائش ہے کہ حضور اکرم ﷺ کے ساتھ کی جانے والی اس گستاخی پر آپ کیا ایکشن لے رہے ہیں؟ آپ اس کا کیا جواب دے رہے ہیں؟ گویا ہمارے ایمان کو چیلینج کیا جاتا ہے۔ نبیٔ کریم ﷺ کی محبت تو ہمارے

ایمان کا جزو ہے۔لایؤمن أحدکم حتی أکون أحب إلیہ من نفسہ ووالدہ وولدہ والناس أجمعین. (نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں کہ تم میں سے کوئی آدمی مؤمن نہیں ہوسکتا جب تک کہ میں اس کی جان، باپ، اولا داور تمام لوگوں سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں)[۱] جب تک حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت سب کی محبت پر غالب نہ ہو، تب تک آدمی کا ایمان مکمل نہیں ہوتا۔آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شان میں اس طرح کی گستاخیاں کرکے اہل ایمان کوغیرت دلائی جارہی ہے، اور چیلینج کیا جارہا ہے کہ ان کو چاہیے کہ ایسا کرنے والوں کی اس حرکت پر اپنا تأثر دیں۔ وہ تأثر کیا ہے؟ جوش میں آکر ان کو گالیاں دینے کے بجائے ایسا جواب دینا چاہیے، جوان پراثرانداز ہو۔

فیس بُک کا استعمال چھوڑ دیجیے:

اور وہ جواب کیا ہے؟ حضرت مولانا مفتی محمد تقی صاحب عثمانی دامت برکاتہم نے کسی موقع پرفرمایا تھا کہ یہ فیس بک ہے، اسی کے ذریعے یہ لوگ ایسی حرکت کرتے ہیں۔ حضرت فرماتے ہیں کہ جب کوئی آدمی فیس بک کوکلک کرتا ہےتو ایک مرتبہ کلک کرنے پر فیس بک والے کوڈھائی ڈالر کا فائدہ ہوتا ہے۔تو یہ لوگ ایسے لاکھوں ڈالر کماتے ہیں۔آپ اس فیس بک کے استعمال کوچھوڑ دیجیے۔ہم لوگ کثرت سے موبائل استعمال کرنے کی وجہ سے اس کے ایسے عادی بن چکے ہیں کہ ہم اپنے دشمنوں کو، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی برائی کرنے والوں کو، نادانستہ طور پر فائدہ اور طاقت پہنچا رہے ہیں۔ان کا جواب یہی ہے کہ جب پیسے کی مار پڑے گی،تو سیدھے ہو جائیں گے۔آپ ان کے خلاف احتجاج کرتے رہو، وہ اس کا کوئی

---

(۱)صحیح البخاري:۱۵ وصحیح مسلم:۴۴.

اثر قبول نہیں کرتے ۔لیکن جب پیسے کی مار پڑتی ہے،تو وہ خود بخود سیدھے ہو جاتے ہیں ۔ اس لیے اہل ایمان کی ایمانی غیرت کا تقاضا یہ ہے کہ ان چیزوں کو استعمال نہ کریں ؛ تاکہ اس کی وجہ سے جو نقصان ہوتو وہ خود ہی ایسی چیزوں سے باز آجائیں گے۔

یہی اصل جواب ہے:

حاصل یہ ہے کہ یہ وعید آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں مکہ مکرمہ کے سردار ایسی حرکتیں کرتے تھے،ان کے لیے اصل تو اس سورت میں نازل ہوئی ؛لیکن ان کے ساتھ خاص نہیں ہے۔ ہمارے اس ملک میں بھی ایسے لوگ ہیں جو–نعوذ باللہ- نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شان میں ایسے گستاخانہ الفاظ استعمال کرتے ہیں،جس کو ہم پڑھتے ہیں تو ہماری ایمانی غیرت جوش میں آجاتی ہے ۔لہٰذا اُن کو ایسے انداز میں جواب دینا چاہیے،جس سے ان کو نقصان پہنچے ۔ یہی اصل جواب ہے۔ جوش میں آکر ایسا طریقہ اختیار نہیں کرنا چاہیے کہ ان کو تو کوئی نقصان نہیں پہنچتا،ہم بلاوجہ بدنام ہو جاتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کی اس سے حفاظت فرمائے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

سورۂ عصر

(مؤرخہ:۲۵رصفر المظفر ۱۴۴۰ھ-مطابق ۳رنومبر ۲۰۱۸ء،شب یک شنبہ)

الحمد لله نحمده ونستعينه ونستغفره ونؤمن به ونتوكل عليه ونعوذ بالله من شرور أنفسنا ومن سيئات أعمالناونعوذبالله من شرورأنفسنا ومن سيئات أعمالنا من يهده الله فلامضل له ومن يضلله فلا هادي له ونشهد أن لا إلٰه إلا الله وحده لا شريك له ونشهد أن سيدنا و مولانا محمداً عبده ورسوله أرسله إلى كافة الناس بشيراً ونذيراً وداعياً إلى الله بإذنه وسراجاً منيراً صلى الله تعالى عليه وعلى اٰله وأصحابه وبارك وسلم تسليماً كثيراً كثيراً.

أما بعد! فأعوذبالله من الشيطٰن الرجيمۜ بسم الله الرحمٰن الرحيمۜ

وَالْعَصْرِ ﴿۱﴾ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ ﴿۲﴾ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ ۙ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ﴿۳﴾

بقامت کہتر بہ قیمت بہتر:

یہ سورۂ عصر ہے، چوں کہ پہلی ہی آیت میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے عصر یعنی زمانے کی قسم کھائی ہے، اس کلمۂ عصر کی وجہ سے اس کا نام سورۂ العصر رکھا گیا ہے۔ یہ قرآن پاک کی دوسرے نمبر کی سب سے چھوٹی سورت ہے۔ پہلے نمبر کی سورۂ کوثر ہے، اس میں دیگر

سورتوں کے مقابلے میں کم سے کم حروف اور کلمات ہیں۔اس سے کچھ کم چھوٹی یہ سورۃ العصر ہے۔گویا یہ دوسرے نمبر کی چھوٹی سورت ہے۔لیکن اپنے مضامین کے اعتبار سے بڑی اہمیت کی حامل ہے۔

زندگی درست کرنے کے لیے:

امام شافعیؒ کا مقولہ ہے کہ اگر لوگ اس سورت میں غور کریں،تو ان کی زندگی کے درست کرنے کے لیے یہ اکیلی کافی ہوجائے گی۔[۱] اور حضرت عبید اللہ بن حصنؒ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے صحابہؓ میں سے دو آدمی جب آپس میں ملتے تھے،تو وہ جدا نہیں ہوتے تھے؛ یہاں تک کہ ان میں سے ہر ایک دوسرے کو سورۂ عصر نہ سنا دے۔گویا اس میں بڑی نصیحت ہے۔ہر ایک سورۂ عصر پڑھ کر اپنے ساتھی کو سناتا تھا،اس کے بعد سلام کر کے جدا ہوتا تھا۔[۲]

شانِ نزول:

اس کے شانِ نزول کے سلسلے میں حضرت شاہ عبد العزیز صاحب دہلویؒ نے تفسیر عزیزی میں لکھا ہے کہ کلب بن اُسید نامی قریش کا ایک آدمی تھا،اس کو''ابوالاَسدَین'' سے بھی یاد کیا جاتا تھا،یہ اس کی کنیت تھی۔حضرت ابوبکرؓ کا زمانۂ جاہلیت میں دوست تھا۔جب حضرت ابوبکرؓ نے اسلام قبول کیا تو ایک دن وہ حضرت ابوبکرؓ کے پاس آیا،اور کہنے لگا: ابوبکر! تم تو بڑے عقلمند آدمی تھے!!! اور ہمیشہ تجارت میں اپنی عقلمندی اور دانائی کی وجہ سے

---

(۱) تفسیر ابن کثیر.

(۲) المعجم الأوسط للطبراني: ۲۱۵/۵ [۵۱۲۴] ط: دار الحرمين، القاهرة.

بہت نفع حاصل کرتے تھے!!! تم نے یہ کیا کیا کہ اسلام قبول کرلیا؟ اور لات اور عزی کے دین اور اپنے باپ دادا کے دین کو چھوڑ کر تم بہت بڑے خسارے میں پڑ گئے، ان کی شفاعت سے محروم ہو گئے۔ تو حضرت ابوبکرؓ نے جواب میں فرمایا: جو آدمی حق قبول کرتا ہے وہ کبھی خسارے میں نہیں رہتا۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اسی گفتگو پر حضرت ابوبکرؓ کی تائید میں اور ان کی بات کی خوبی کے بیان میں یہ سورت نازل فرمائی۔ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ نے یہ شانِ نزول بتلایا ہے۔[۱]

اللہ تعالیٰ نے زمانے کی قسم کھائی ہے: وَالْعَصْرِ ۔ عصر: زمانے کو بھی کہتے ہیں، عصر کا وقت بھی مراد لیا جاسکتا ہے، اور آدمی کی زندگی کا زمانہ بھی مراد لیا جاسکتا ہے۔

قسم یقین دہانی کے لیے:

پہلی بات تو یہ ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہاں جو قسم کھائی ہے، عام طور پر انسان اور لوگ اپنی باتوں میں جب قسم کھاتے ہیں، قسم کا استعمال بسا اوقات مخاطب کو اپنی بات کا اطمینان اور یقین دلانے کے لیے ہوتا ہے۔ گویا وہ اپنی سچائی ظاہر کرنے کے لیے قسم کھاتا ہے۔ اس مقصد کے لیے اللہ تبارک وتعالیٰ کو قسم کھانے کی ضرورت نہیں ہے۔ وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ قِيْلًا (النساء:۱۲۲) اللہ سے زیادہ کون سچا ہوسکتا ہے؟

قسم بطورِ دلیل:

البتہ فصاحت وبلاغت کے اعتبار سے کبھی کبھی اپنی بات اور گفتگو میں قوت پیدا کرنے کے لیے بھی قسم استعمال کی جاتی ہے۔ ہاں! اس مقصد کے لیے تسلیم کرسکتے ہیں۔

---

(۱) تفسیر عزیزی ص: ۶۳۴، کتب خانہ فیض ابرار، انکلیشور، گجرات۔

حضرات مفسرین نے لکھا ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے کلام میں جو قسم ہے وہ دراصل ایک دلیل اور شاہد کے طور پر ہے، اس چیز پر جس کی اللہ نے قسم کھائی ہے۔ اللہ نے قرآن پاک میں بہت ساری چیزوں کی قسم کھائی ہے۔ زمانے کی، قلم کی، بلدامین- مکہ مکرمہ- کی، قیامت وغیرہ۔ لَآ اُقْسِمُ بِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ (القیمۃ-۱) وَ هٰذَا الْبَلَدِ الْاَمِيْنِ (التین-۳) وَ الْقَلَمِ وَ مَا يَسْطُرُوْنَ (القلم-۱) وَ الْعَصْرِ (العصر-۱) ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے جس چیز کی قسم کھائی ہے، وہ مابعد کے مضمون کی صداقت کے لیے بطور دلیل اور شاہد ہے۔ دیکھو! جس چیز کی قسم کھائی جا رہی ہے اگر اس کی حقیقت میں تم غور کرو گے، تو اس کے بعد جو چیز بیان کی جا رہی ہے، تمہیں اس کی سچائی کا اندازہ ہو جائے گا۔ تو اللہ تعالیٰ جو قسمیں کھاتے ہیں، وہ عموماً اسی مقصد کے لیے ہوتی ہیں۔ یہاں بھی اللہ تبارک وتعالیٰ نے زمانے کی قسم کھائی ہے، اس کے بعد حقیقت بیان کی گئی ہے کہ: اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِيْ خُسْرٍ (بے شک تمام انسان خسارے اور گھاٹے میں ہیں) یہاں ایک مضمون بیان فرمایا ہے کہ تمام انسان خسارے اور گھاٹے میں ہیں، اس کی صداقت اور تاکید کے لیے زمانے کی قسم کھائی گئی۔ گویا باری تعالیٰ فرماتے ہیں کہ زمانے کے حالات میں اگر کوئی آدمی غور کرے تو اس کو یہ بات صاف معلوم ہوگی کہ انسان خسارے اور گھاٹے میں ہے۔

زندگی ایک تجارت:

کیوں؟ اس لیے کہ انسان کو دنیا میں آخرت کی تجارت کرنی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں فرمایا ہے: يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰى تِجَارَةٍ تُنْجِيْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ. (الصف-۱۰) گویا اس زندگی کے سارے کاموں کو ایک تجارت سے تعبیر کیا ہے۔ دوسری جگہ

ہے: إِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَ اَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ (التوبة-۱۱۱) (اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کی جانوں اور مالوں کو جنت کے بدلے خرید لیا) گویا جنت اس کی قیمت مقرر کی گئی ہے۔ قرآن نے اس کو تجارت سے تعبیر کیا۔

اور حدیث شریف میں بھی نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: كُلُّ الناس يَغْدُو، فبائع نَفْسَه فمُعْتِقُهَا أو مُوبِقُهَا. (ہر انسان جب صبح کو اپنے گھر سے نکلتا ہے تو وہ اپنی جان کا سودا کرتا ہے، یا تو وہ اپنے آپ کو بچا لے جاتا ہے یا اپنے آپ کو ہلاک کر دیتا ہے)[۱] اگر اللہ کی اطاعت اور فرماں برداری کی، اللہ تعالیٰ کے احکام کی بجا آوری کی، اللہ کے حکم کے مطابق دن گزارا، تو وہ اپنے آپ کو بچا لے گیا، اپنی جان کو جہنم کے عذاب سے آزاد کرا لیا۔ اور اگر اس کے خلاف کیا ہے تو اپنے آپ کو ہلاک کر دیا۔ تو نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں: كُلُّ الناس يَغْدُوا، فبائع نَفْسَه. (ہر آدمی جب صبح کو نکلتا ہے تو اپنی جان کا سودا کرتا ہے) اس کو تجارت سے تعبیر کیا۔ گویا اللہ نے انسان کو جو دنیا میں بھیجا ہے، اس کے لیے یہ ایک تجارت ہے۔

ہو رہی ہے عمر مثل برف کم:

اس تجارت کا سرمایہ کیا ہے؟ ہر تجارت کے لیے کوئی نہ کوئی پونجی، کیپیٹل (Capital) اور سرمایہ ہوا کرتا ہے۔ تاجر سرمایے اور کیپیٹل سے تجارت کرتا اور نفع کماتا ہے۔ اور سرمایے کو بھی ترقی دیتا اور بڑھاتا ہے۔ تو انسان کی تجارت کے لیے سرمایہ کیا ہے؟ اللہ تعالیٰ نے انسان کو تجارت کے لیے جو سرمایہ عطا فرمایا ہے، وہ اس کی زندگی ہے۔ یہ ایک ایسا سرمایہ ہے جو ہر وقت گھٹتا جا رہا ہے، اس میں کمی آتی جا رہی ہے۔ ایک عربی شاعر کا شعر ہے:

---

(۱) أخرجه مسلم برقم: ۲۲۳.

حیاتك أنفاس تُعَدُّ فكلّما　　مضى نَفَسٌ منها انتقصت بها جزءًا

(تمہاری زندگی چند سانسوں کا نام ہے، جب تمہاری ایک سانس گزری تو گویا تمہاری زندگی میں اتنی کمی آگئی)

جوں جوں وقت گزرتا جاتا ہے زندگی میں کمی آتی جاتی ہے۔ اور زندگی گزرتی جارہی ہے، ہم اس کو روک نہیں سکتے۔ حضرت خواجہ صاحب کا شعر ہے:

ہو رہی ہے عمر مثلِ برف کم　　چپکے چپکے رفتہ رفتہ دم بہ دم

دو سرمایے:

حضرت مفتی شفیع صاحبؒ فرماتے ہیں: سرمایے دو طرح کے ہوتے ہیں:

(۱) منجمد: ایسا سرمایہ کہ آدمی جب اس کو استعمال کرے تب وہ اس کے ہاتھ سے نکلے گا۔ اگر اس کو استعمال نہ کرے تو وہ باقی رہتا ہے۔ مثلاً: آپ کے پاس اگر ایک لاکھ روپے ہیں، تو یہ منجمد سرمایہ ہے۔ آپ ابھی استعمال نہ کرنا چاہیں، تو پیٹی یا تجوری میں رکھ دو، ایک مہینے کے بعد، ایک سال کے بعد، دو سال کے بعد اس کو نکال کر استعمال کر سکتے ہیں، وہ اپنی حالت پر باقی رہیں گے۔

(۲) سیّال: یعنی جاری سرمایہ۔ مثلاً: آپ اس سے فوری طور پر فائدہ اٹھا لیں تب تو ٹھیک ہے؛ ورنہ رفتہ رفتہ وہ آپ کے ہاتھ سے نکل جائے گا۔ جیسے: ایک بزرگ ایک مرتبہ بازار سے گزر رہے تھے، انہوں نے دیکھا کہ ایک آدمی برف بیچ رہا ہے۔ وہ آواز لگا رہا تھا: لے لو اُس آدمی کی چیز! جو ہر وقت اس کے ہاتھ سے نکلتی جارہی ہے۔ برف تو پگھلتا رہتا ہے، اب وہ جتنا جلدی اس کو بیچ کر اس کے پیسے بنالے تب تو ٹھیک ہے، اور اگر برف جلدی نہیں

بکاتو وہ دھیرے دھیرے پگھل کر ختم ہوجائے گا۔اس کا سرمایہ اس کے ہاتھ سے نکل جائے گا۔ ہماری زندگی کے ایام بھی ایسے ہی ہیں۔[۱]

آج اگر ہم کو کوئی کام نہیں ہے تو آج کے دن کو ہم فریز ڈکر کے رکھنا چاہیں، یا تجوری میں بند کر کے رکھنا چاہیں کہ آج تو کچھ کام نہیں ہے، چلو! اس دن کو محفوظ کرلیں، کبھی کام ہوگا تو اس دن کو ہم استعمال کریں گے۔ ایسا کر سکتے ہیں؟ نہیں ۔ ہم اس کو بچا کر رکھ نہیں سکتے، وہ ہمارے ہاتھ سے نکلتا چلا جارہا ہے۔تو یہ ایک ایسا سیال سرمایہ ہے کہ اگر ہم اس سے ہاتھوں ہاتھ فائدہ اٹھالیں تب تو ٹھیک ہے؛ ورنہ ہم گھاٹے میں ہیں۔

اس کو ایک مثال سے یوں سمجھو کہ اگر کسی آدمی کے پاس سورت شہر کے کسی اعلیٰ مارکیٹ ایریا میں ایک بیگہ زمین ہے، جو کروڑوں کی قیمت کی ہے۔ یہ زمین ایسا منجمد سرمایہ ہے، جو اس کے ہاتھ سے اس وقت تک نہیں نکلے گا، جب تک اس کو بیچ کر اس سے نفع حاصل نہ کرلے۔اوراس کے پاس پیسے بھی ہیں۔کسی نے کہا کہ دیکھو! یہ بڑی موقع کی زمین ہے، اگرتم یہاں کوئی تجارتی سینٹر بناؤ، ایک بڑی عمارت بناؤ، جس میں دکانیں بھی ہوں، دفتر بھی ہوں، تو ان سے آپ کو کروڑوں کی شکل میں کرایہ ملے گا۔ چناں چہ اس نے اس زمین پر ایک بہت بڑی عمارت بنائی، دکانیں، آفسیں سب کچھ بنایا۔اب وہ عمارت تیار ہوگئی۔ خود زمین، دکانیں، دفتر تو منجمد سرمایے ہیں؛ لیکن اب ان دکانوں اور دفتروں کو کرایے پر دے کر جو آمدنی حاصل کرے گا، تو وہ کرایہ ایک سیال سرمایہ ہے۔اس طرح کہ عمارت تیار ہوگئی، آفسیں اور دکانیں بن گئیں، لوگ کرایے پر لینے آرہے ہیں: مجھے تمہاری دکان کرایے پر چاہیے، تو یہ کہتا ہے: ابھی نہیں! میں ذرا سوچتا ہوں! ابھی نہیں! ابھی نہیں! کرتے کرتے

(۱) معارف القرآن-سورۂ عصر (حضرت مفتی شفیع صاحب عثمانیؒ)۔

دوسال نکال دیے، تو اب دوسال کا جو کرایہ آسکتا تھا، اس نے اس کو ضائع اور برباد کر دیا۔ الغرض دکانیں الگ سرمایہ، اور ان سے حاصل ہونے والا کرایہ الگ سرمایہ ہے۔ کرایہ سیال سرمایہ ہے، کرایہ پر دے کر ہاتھوں ہاتھ نفع حاصل کرتا ہے، تو ٹھیک، ورنہ اتنا نقصان ہوگا۔ آئندہ بھی جتنی دیر کرتا جائے گا اتنا مزید نقصان ہوگا۔

گردوں نے گھڑی عمر کی اک اور گھٹادی:

توحقیقت یہ ہے کہ ہماری زندگی کے ان ایام کو ہم جتنا زیادہ اللہ کی اطاعت وفرماں برداری میں، عبادت میں، ذکر وتسبیح میں اور مأمور بہا امور میں صرف کریں گے، تو ان اوقات کے ذریعے ہم آخرت کا ذخیرہ حاصل کر سکتے ہیں۔ اور اگر ہم نے کچھ نہیں کیا، یہاں تک کہ یہ اوقات ہمارے ہاتھ سے نکل گئے، تو کم از کم یہ نقصان تو ضرور ہوا کہ ان اوقات میں ہم آخرت کی جو بڑی دولت حاصل کر سکتے تھے وہ حاصل نہیں کر پائے۔ اور اگر خدانخواستہ ان اوقات کو ہم نے اللہ کی نافرمانی میں استعمال کیا، یہ تو اپنا ڈبل نقصان کیا۔ جب آدمی اپنی زندگی پر غور کرتا ہے تو پتا چلتا ہے کہ وہ ہر حال میں اس کے ہاتھ سے نکلی چلی جارہی ہے، اور ہر آدمی نقصان اور گھاٹے میں ہے۔ سرمایہ اس کا کم ہوتا جارہا ہے۔

جب سال پورا ہوتا ہے تو لوگ سال گرہ مناتے ہیں، اور خوشیاں مناتے ہیں؛ اگرچہ یہ اسلامی طریقہ نہیں ہے، غیر اسلامی طریقہ ہے، لیکن لوگوں کی دیکھا دیکھی مسلمان بھی یہ حرکت کرتے ہیں۔ سال گرہ منانے والے دعوتیں کرتے ہیں، خوشی کا اظہار کرتے ہیں کہ ہماری زندگی میں ایک سال بڑھ گیا، ہم بائیس سال کے تھے، اب تیئیس سال کے ہو گئے۔ اکبر الٰہ آبادی بڑے حقائق پیش کرنے والے ہیں۔ انہوں نے ایسے لوگوں سے کہا ہے:

بڑھا کہاں؟ گھٹا ہے۔ مان لیجیے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو ساٹھ سال کی زندگی عطا فرمائی ہے، تو جب ایک سال ہوگا تو یوں کہا جائے گا کہ ساٹھ سال میں سے ایک سال کم ہوا۔ ہم لوگ تعبیر یوں کرتے ہیں کہ بڑھا۔ یہ دھوکا ہے۔ اکبر الہ آبادی اس کو اپنے شعر میں کہتے ہیں:

جب سال گرہ ہوئی تو عقدہ یہ کھلا　　　یہاں گرہ سے ایک اور برس جاتا رہا

ہماری گانٹھ میں سے ایک برس گیا۔ پہلے زمانے میں لوگ پیسے اپنی اوڑھی ہوئی چادر کے کنارے میں باندھتے تھے۔ جیسے گجراتی میں کہتے ہیں: ગાંઠના ખર્ચ્યા۔ تو گرہ میں سے یعنی اپنی جیب میں سے۔ یعنی جب سال گرہ ہوئی تو یہ بھید کھلا کہ اپنی جیب میں سے ایک سال گیا، بڑھا نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ جو قیمتی سرمایہ عطا فرمایا ہے، اس سے جتنا زیادہ فائدہ اٹھا سکتا ہو اٹھانا چاہیے۔ جو لوگ فائدہ اٹھاتے ہیں وہ کامیاب ہیں، ورنہ ہاتھ سے یہ دولت نکلی چلی جا رہی ہے اور انسان گھاٹے میں ہے۔

چالیس سال سے روٹی نہیں کھاتے تھے!!!

اسی لیے ہمارے بزرگوں کے حالات میں سنتے ہیں کہ وہ ایک ایک منٹ کی اور ایک ایک لمحہ کی قدر کیا کرتے تھے!!! آپ نے فضائل کی کتابوں میں سنا ہوگا کہ شیخ علی جرجانیؒ ایک اللہ والے تھے۔ وہ روٹی کھانے کے بجائے ستو پھانک لیا کرتے تھے۔ کسی نے پوچھا کہ حضرت! آپ صرف ستو پھانک لیا کرتے ہیں، روٹی نہیں کھاتے؟ تو فرمایا کہ میں نے حساب لگایا کہ روٹی کھانے میں چبانا پڑتا ہے، اس میں دیر لگتی ہے۔ لہٰذا میں ستو پھانک لیتا ہوں، تو مجھے ۷۰ رمرتبہ سبحان اللہ زیادہ پڑھنے کا فائدہ ہوتا ہے۔ چناں چہ ان کے متعلق لکھا ہے کہ ۴۰ رسال سے وہ روٹی نہیں کھاتے تھے، صرف ستو پھانکتے تھے:

تاکہ جو وقت بچے اس کو تسبیح پڑھنے میں استعمال کریں۔[1] آپ اندازہ لگائیں! جو آدمی اپنے کھانے کے ٹائم میں سے کٹنگ کرکے تسبیح پڑھتا ہو وہ کبھی دوسرے وقت کو ضائع کرسکتا ہے؟

قرآن پاک کی پچاس آیتیں پڑھ سکتا ہوں:

حضرت داود طائیؒ کے متعلق منقول ہے کہ وہ روٹی چبا کر کھانے کے بجائے پانی میں بھگو دیتے تھے۔ کھانے کے لیے روٹی آتی تو اس کو پانی میں بھگو دیتے تھے، جب نرم ہو جاتی تو منہ میں ڈال کر حلق سے نیچے اتار لیتے تھے۔[2] روٹی کا مقصد ہے غذا، جب حلق سے نیچے جائے گی تب بھی وہ مقصد حاصل ہو جائے گا۔ البتہ بھگو کر کھانے کی وجہ سے لذت اور ذائقہ نہیں رہے گا۔ ہمارا حال تو یہ ہے کہ جب پلیٹ میں پانی کے ایک دو قطرے رہ گئے ہوں اور روٹی کا جو حصہ وہاں لگا ہوا ہے، وہ جب منہ میں آتا ہے تو ذائقہ نہ ہونے کی وجہ سے ہمارا موڈ خراب ہو جاتا ہے؛ لیکن انہوں نے زندگی بھر اسی طرح روٹی کھائی۔ کیوں؟ وہ کہتے تھے کہ میں نے روٹی چبا کر کھانے اور بھگو کر کھانے کے درمیان حساب لگایا، تو معلوم ہوا کہ میں اتنی دیر میں قرآن پاک کی پچاس آیتیں پڑھ سکتا ہوں۔ یہ وہ حضرات تھے جو اپنی زندگی کے اوقات کو وصول کرنے کا اہتمام کرتے تھے۔ اور ایک ایک منٹ کی قدر کرتے تھے۔

آخرت کی تجارت بڑی نفع بخش ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس امت کو جو خصوصیات و

---

(۱) إحياء علوم الدين للغزالي، كتاب كسر الشهوتين، الفائدة السابعة: تيسير المواظبة على العبادة و الضوء اللامع للسخاوي: ۵/ ۳۲۸- ۳۳۰ (ط: دار مكتبة الحياة، بيروت) والبدر الطالع للشوكاني: ۱/ ۴۸۸-۴۹۰ (ط: دار المعرفة، بيروت).

(۲) حلية الأولياء للأصفهاني: ۷/ ۳۴۵ و ۷/ ۳۴۸- ۳۵۰ (ط: دار الكتب العلمية، بيروت).

امتیازات عطا فرمائے، ان میں سے ایک خصوصیت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر نیکی کا بدلہ دس گنا رکھا ہے۔ یہ تو کم سے کم ہے، اور جب بڑھتے ہیں تو دس گنا سے سات سو گنا تک۔ اور اگر مال خرچ کیا جاتا ہے تو اس کی کوئی انتہا ہی نہیں ہے، أضعافاً مضاعفة کا وعدہ فرمایا ہے۔

مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِيْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ ؕ وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ (البقرة-۲۶۱) اللہ جس کو چاہیں اس کو سات سو سے بھی زیادہ دے سکتے ہیں۔ روزے کے متعلق وارد ہے کہ اس کا ثواب اللہ تعالیٰ دیتے ہیں۔ تو اس امت کو نیکیوں کا اتنا زیادہ بڑھا وا ملا ہے، جب آدمی اس کو سوچے اور آخرت کے لیے عمل کرے تو بہت کچھ ذخیرہ آخرت کے لیے جمع کر سکتا ہے۔ لیکن جو لوگ اس عمر سے فائدہ نہیں اٹھاتے اور ان کی عمریوں ہی گزرتی جا رہی ہے وہ گھاٹے میں ہیں۔

چار صفات:

اسی کو کہا گیا: وَالْعَصْرِ، اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِيْ خُسْرٍ۔

(قسم ہے زمانے کی، بے شک انسان بڑے گھاٹے میں ہے)

انسان سے مراد نوع انسانی ہے۔ البتہ کون لوگ گھاٹے اور خسارے میں نہیں ہیں؟

جو چار کام کرتے ہیں، وہ گھاٹے اور خسارے میں نہیں ہیں:

اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ (مگر وہ لوگ جو ایمان لائے اور اعمال صالحہ کیے) گویا انہوں نے اپنی ذات کو ٹھیک کر لیا، کامل بن گئے، اپنے اندر کمال پیدا کر دیا۔

وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ (اور ایک دوسرے کو حق بات کی اور صبر کی نصیحت کریں) دوسروں کو حق بات اور صبر کی نصیحت کرنا، دوسروں کو درجۂ کمال تک پہنچانا

ہے۔خود کامل بنیں اور دوسروں کو کامل بنانے کے لیے محنت کریں، مکمِّل بنیں ۔ یہ چار صفتیں جس کے اندر ہوں گی وہ خسارے میں نہیں ہے۔

......ہم خسارے سے نہیں بچ سکتے:

اس سے معلوم ہوا کہ خسارے سے بچنے کے لیے آدمی کا صرف اپنے طور پر کامل بن جانا کافی نہیں ہے۔ہم نے ایمان قبول کر کے اعمال صالحہ کا اہتمام کرلیا، اپنی زندگی ٹھیک کر لی؛ پھر بھی ہم گھاٹے سے نکلے نہیں ہیں۔گھاٹے سے نکلے ہوئے اس وقت کہلائیں گے جب دوسروں کی بھی اصلاح اور کمال کی فکر کریں گے۔ بالخصوص اپنے ماتحتوں اور جن پر ہمیں اقتدار و اختیارات حاصل ہیں، ان کو جب تک کامل و مکمل بنانے کی محنت نہیں کریں گے، حق کی نصیحت و وصیت نہیں کریں گے،تب تک ہم خسارے سے بچ نہیں سکتے۔

حق سے مراد عقائد حقہ اور اعمال صالحہ اور صبر سے مراد گناہوں سے بچنے کی تاکید ہے۔بعض حضرات نے حق سے مراد صرف عقائد حقہ، اور صبر سے اعمال صالحہ اور گناہوں سے بچنے کی تاکید دونوں کو شامل کرلیا ہے،یعنی یہ دونوں کام بھی ساتھ ہونے چاہیے۔جب تک یہ نہیں ہوگا تب تک آدمی اپنے آپ کو خسارے اور گھاٹے سے نہیں بچا سکتا۔اس سے معلوم ہوا کہ گھاٹے سے بچنے کے لیے صرف اپنے آپ کو ٹھیک کر لینا کافی نہیں ہے؛ بلکہ دوسروں کو کامل بنانے کے لیے محنت کرنا بھی ضروری ہے۔حق اور صبر کی وصیت اور گناہوں سے بچنے کی تاکید،یعنی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ضروری ہے،اس کے بغیر آدمی اپنے آپ کو خسارے اور گھاٹے سے نہیں بچا سکتا۔

جب کوئی برائی دیکھے تو......

امر بالمعروف کے سلسلے میں آپ نے فضائل تبلیغ میں سنا ہوگا، بخاری شریف میں حضرت ابوسعید خدریؓ کی روایت ہے: حضور ﷺ نے فرمایا: من رأی منکم منکراً فلیغیره بیده. (تم میں سے کوئی آدمی جب کوئی غلط کام دیکھے، تو اس کو اپنے ہاتھ سے سدھارے) ومن لم یستطع فبلسانه (جو اس کو ہاتھ سے روکنے اور سدھارنے کی طاقت نہیں رکھتا وہ اپنی زبان سے روکے) ومن لم یستطع فبقلبه وذلک أضعف الإیمان. (اور جو ہاتھ سے بھی درست کرنے کی طاقت نہیں رکھتا وہ اپنے دل سے اس کو برا سمجھے اور یہ ایمان کا سب سے کمزور درجہ ہے)[۱]

ہاتھ سے روکنے کا مطلب:

ہاتھ سے روکنے کی طاقت سے مراد یہ ہے کہ اس کو اقتدار حاصل ہو۔ علماء نے اس حدیث کی شرح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ جو لوگ صاحب اقتدار ہیں وہ اپنے ہاتھ سے برائیوں کو دور کرنے کا اہتمام کریں۔ صاحب اقتدار، مثلاً: بادشاہ وقت ہے، حاکم وقت ہے یا اس کے ماتحت مختلف علاقوں کے حکام، جن کو بادشاہ کی طرف سے حاکم بنایا گیا ہے، وہ اپنے اس اقتدار سے جس علاقے پر ان کو حکومت حاصل ہے، اس سے برائیوں کو دور کر سکتے ہیں، کوئی ان کو روکنے والا نہیں ہے۔ اگر ان کے پاس طاقت ہے، تو اس طاقت کے ذریعے سے وہ ان برائیوں کو دور کر سکتے ہیں۔ طاقت کا یہ مطلب نہیں ہے کہ فلاں برا کام کر رہا ہے تو میں ڈنڈا لے کر جاؤں۔ نہیں! اگر آپ ڈنڈا لے کر جائیں گے، تو وہ آپ کے مقابلے پر

(۱) صحیح مسلم: ۴۹.

آئے گا، اور پھر جھگڑے ہوں گے۔ شریعت نے ہاتھ سے دور کرنے کا حکم اسی کو دیا ہے جس کو اقتدار حاصل ہو۔

اقتدار کی مختلف شکلیں ہیں۔ بعض حضرات کو محدود اقتدار حاصل ہوتا ہے، جیسے اپنے گھر میں ہم میں سے ہر ایک کو اپنی بیوی، اپنی اولاد اور اپنے ماتحتوں پر اقتدار حاصل ہے۔ اگر وہ کوئی برا کام کر رہے ہیں تو ہم طاقت سے ان کو روک سکتے ہیں۔ وہاں یہ کام کرنا چاہیے، نہیں کریں گے تو گنہگار ہوں گے۔ اس کے علاوہ دوسروں کو وہی روکے جو صاحب اقتدار ہو، اقتدار نہ ہو تو وہاں دوسرا طریقہ ہے۔

ایمان کا کمزور درجہ:

ومن لم یستطع فبلسانہ. زبان سے روکے۔ اگر ہم لوگوں کو برائی کرتا ہوا دیکھیں اور ہمارے پاس اقتدار نہیں ہے، تو ڈنڈا لے کر نہیں جائیں گے؛ بلکہ ان کو زبان سے روک دیں گے، ان چیزوں کی برائی ان کے سامنے بیان کریں گے، نیکی کا کام ہے تو اس کی اہمیت اور فضائل بیان کریں گے، اور اس پر عمل کرنے کے لیے آمادہ کریں گے۔ اس کے بعد وہ عمل نہ کرے تو ہماری جو ذمہ داری تھی وہ پوری ہوگئی۔ فبلسانہ. اور اگر اس کی بھی طاقت نہ ہو کہ زبان سے روکنے کی صورت میں سامنے والے کی طرف سے شدید اور نا قابل برداشت نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے تو اس صورت میں صرف دل سے برا سمجھے؛ لیکن یہ ایمان کا کمزور درجہ ہے۔

وصیت کے معنیٰ:

بہر حال! وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ ۙ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ میں بھلی باتوں کا حکم اور بری باتوں

سے روکنا ہے۔جس کو تواصي سے تعبیر کیا ہے۔ وصیت دراصل اس نصیحت کو کہتے ہیں جو آدمی موت کے وقت اپنے متعلقین کو کرتا ہے۔ وہ بڑی تاکید اور دل سوزی کے ساتھ کی جاتی ہے، بڑی شفقت اور محبت کے ساتھ کی جاتی ہے، اس لیے اس کو وصیت سے تعبیر کیا گیا ہے، تو گویا آپ بھی کسی کو بھلی بات کا حکم کریں تو اسی انداز سے کریں۔بھلی بات کا حکم کرنے میں بھی ہمارا طریقہ درست ہو۔

حق بات حق طریقے سے:

حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ فرماتے ہیں کہ حق بات، حق نیت سے اور حق طریقے سے اگر کہی جائے تو کبھی نقصان نہیں کرتی۔ (اصلاحی خطبات ۸/ ۳۵) بعض لوگ یوں کرتے ہیں کہ میں بڑا ہوں، میری بزرگی ان کے سامنے ظاہر ہو، اپنی بڑائی ظاہر کرنے یا سامنے والے کو بے عزت کرنے والا انداز اختیار کریں تو یہ نیت درست نہیں ہے۔ نیت بھی درست ہے؛ لیکن اس کے لیے لوگوں کے ساتھ جو طریقہ اپناتا ہے، وہ اس انداز سے کہتا ہے کہ سننے والا اپنی بے عزتی محسوس کرتا ہے، تو بہت سی مرتبہ یہ طریقہ ہی سامنے والے کو ضد پر آمادہ کرتا ہے ، وہ بات قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔

بہر حال! تینوں باتوں کا دھیان رکھنا چاہیے۔ بات بھی درست ہو، صحیح نیت سے کہنا چاہیے اور صحیح طریقہ سے کہنا چاہیے تو ان شاء اللہ کبھی نقصان نہیں ہوگا۔تو جو لوگ ایمان اور عمل صالح سے اپنے آپ کو کامل بنا لیتے ہیں اور دوسروں کو کامل بنانے کے لیے آپس میں ایک دوسرے کو حق کی اور صبر کی نصیحت کرتے رہتے ہیں وہ البتہ گھاٹے میں نہیں ہیں۔ ان کا استثناء کر دیا گیا ہے۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

سورۂ تکاثر

(مؤرخہ: ۹/ربیع الاول، ۱۴۴۰ھ-مطابق ۱۷ نومبر ۲۰۱۸ء، شب یک شنبہ)

الحمد لله نحمده ونستعينه ونستغفره ونؤمن به ونتوكل عليه ونعوذ بالله من شرور أنفسنا ومن سيئات أعمالناونعوذبالله من شرورأنفسنا ومن سيئات أعمالنا من يهده الله فلامضل له ومن يضلله فلا هادي له ونشهد أن لا إلٰه إلا الله وحده لا شريك له ونشهد أن سيدنا و مولانا محمداً عبده ورسوله أرسله إلى كافة الناس بشيراً ونذيراً وداعياً إلى الله بإذنه وسراجاً منيراً صلى الله تعالى عليه وعلى آله وأصحابه وبارك وسلم تسليماً كثيراً كثيراً.

أما بعد! فأعوذبالله من الشيطٰن الرجيم۝ بسم الله الرحمٰن الرحيم۝

اَلۡهٰكُمُ التَّكَاثُرُۙ۝۱ حَتّٰى زُرۡتُمُ الۡمَقَابِرَؕ۝۲ كَلَّا سَوۡفَ تَعۡلَمُوۡنَۙ۝۳ ثُمَّ كَلَّا سَوۡفَ تَعۡلَمُوۡنَؕ۝۴ كَلَّا لَوۡ تَعۡلَمُوۡنَ عِلۡمَ الۡيَقِيۡنِؕ۝۵ لَتَرَوُنَّ الۡجَحِيۡمَۙ۝۶ ثُمَّ لَتَرَوُنَّهَا عَيۡنَ الۡيَقِيۡنِۙ۝۷ ثُمَّ لَتُسۡـَٔـلُنَّ يَوۡمَئِذٍ عَنِ النَّعِيۡمِ۝۸

یہ سورۂ تکاثر ہے، مکہ مکرمہ میں نازل ہوئی۔

شانِ نزول:

اس کے شانِ نزول کے سلسلے میں حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب دہلویؒ نے تفسیر فتح

العزیز میں لکھا ہے کہ قریش کے دو بڑے قبیلے تھے: بنوعبد مناف اور بنوسہم۔ بنوعبد مناف سے حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا تعلق ہے، عبد مناف حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دادا عبدالمطلب کے دادا ہوتے ہیں۔ عبدالمطلب بن ہاشم بن عبد مناف۔ عبد مناف کے چار بیٹے تھے۔ اور دوسرا قبیلہ بنوسہم جس کا سردار عاص بن وائل سہمی تھا۔ ان دونوں خاندانوں میں ایک مرتبہ اپنی بڑائی، برتری اور اپنے فائق ہونے کے معاملے میں بحث ہوگئی۔ ہر ایک اپنی دولت اور ثروت کو بیان کر رہا ہے کہ ہمارے پاس اتنا مال ہے، اپنے کارناموں کو بیان کر رہا ہے، ہم نے اتنی شادیاں کیں، ہم نے ایسی مہمان نوازیاں کیں، اور ہم نے ایسے ایسے کارنامے انجام دیے۔ یہاں تک کہ آخر میں خاندان کے افراد کتنے ہیں؟ اس پر بات آئی۔ جب افراد شمار کیے گئے تو اس میں بنوعبد مناف کے افراد بنوسہم کے مقابلہ میں کچھ زیادہ تھے۔ تو بنوسہم نے یوں کہا کہ ہم چوں کہ بہادر لوگ ہیں، جنگوں میں ہمارے آدمی زیادہ مارے گئے، تو جو زندہ ہیں صرف ان کی گنتی نہیں؛ بلکہ جو جا چکے ہیں ان کی بھی گنتی ہونی چاہیے۔ چناں چہ قبرستان گئے، اِس کو گنو، اُس کو گنو، قبریں گنی جا رہی ہیں۔ اس پر اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے ان کی اس جہالت کو بیان کرنے اور ان کی اس غفلت کی مذمت کرنے کے لیے یہ سورت نازل کی گئی۔[۱]

فضیلت:

اس کی فضیلت کے سلسلے میں مستدرک حاکم کی روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک مرتبہ حضرات صحابہؓ کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ تم میں سے کوئی آدمی کیا اس کی قدرت نہیں رکھتا کہ قرآن پاک کی ایک ہزار آیتوں کی تلاوت کرلے؟ صحابہؓ نے عرض کیا

(۱) تفسیر عزیزی ص: ۶۲۹، کتب خانۂ فیض ابرار، انکلیشور، گجرات۔

کہ اے اللہ کے رسول! اس کی تو کون قدرت رکھے گا کہ روزانہ ایک ہزار آیتیں تلاوت کرے!!! نبی کریم ﷺ نے فرمایا: کیا تم میں سے کوئی آدمی سورۃ اَلۡهٰکُمُ التَّکَاثُرُ نہیں پڑھ سکتا؟ گویا جو اس کو پڑھے گا وہ قرآن پاک کی ایک ہزار آیتیں پڑھنے کے برابر سمجھا جائے گا۔[۱]

تکاثر کیا ہے؟:

اَلۡهٰکُمُ التَّکَاثُرُ، حَتّٰی زُرۡتُمُ الۡمَقَابِرَ

تکاثر مال و دولت اور عیش و عشرت اور راحت حاصل کرنے کے لیے ایک دوسرے کا مقابلہ کرنے کو کہتے ہیں۔ آج کل دنیا میں ہر ایک کی کوشش یہی ہے کہ میں مال و دولت میں فلاں سے آگے نکل جاؤں، اس سے زیادہ مال حاصل کروں، اس سے زیادہ عیش و عشرت کے سامان مہیا کروں، اس سے زیادہ راحت کے اسباب جمع کروں۔ گویا دولت و ثروت، عیش و عشرت اور راحت کے اسباب حاصل کرنے میں ایک دوسرے کا مقابلہ ہو رہا ہے۔ فلاں کا بنگلہ اتنا بڑا ہے میرا اس سے بڑا ہونا چاہیے۔ فلاں کی فیکٹری اتنی بڑی ہے میری فیکٹری اس سے بڑی ہونی چاہیے۔ فلاں کے پاس اتنی کاریں ہیں میرے پاس اس سے زیادہ کاریں ہونی چاہیے۔ فلاں کا بینک بیلینس اتنا بولتا ہے، یہ میلینر شمار ہوتا ہے، تو میں ٹریلینر بن جاؤں۔ وہ کروڑ پتی ہے تو میں ارب پتی بن جاؤں۔ یہی مقابلہ ہے اور پوری دنیا میں یہی چکر چل رہا ہے۔ اور اسی نے سارے انسانوں کو اپنی زندگی کے اصل مقصد سے

---

(۱) المستدرک علی الصحیحین: ۲۰۸۱ و قال الحاکم رواۃ ھذا الحدیث کلھم ثقاۃ (ط: دار الکتب العلمیۃ، بیروت).

غافل کر دیا ہے، ہٹا دیا ہے۔

موت کا کوئی انکار نہ کر سکا:

دنیا کا نظام کئی صدیوں سے چل رہا ہے، ہم دیکھتے ہیں کہ ایک انسان پیدا ہوتا ہے، بچہ ہوتا ہے، پھر جوان ہوتا ہے، پھر ادھیڑ عمر کو پہنچتا ہے، پھر بوڑھا ہوتا ہے، پھر مر کر قبر میں پہنچ جاتا ہے۔ بہت سے وہ بھی ہیں جو بڑھاپے کی عمر آنے سے پہلے ہی دنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں؛ لیکن کیا آج تک کوئی ایک آدمی بھی ایسا نظر آیا جو یہاں آیا ہو اور ہمیشہ رہا ہو؟ موت نے اس کو اپنا شکار نہ بنایا ہو؟ ایسا کوئی آدمی ہے؟ نہیں ہے۔ سالہا سال ہو گئے، صدیاں بیت گئیں، دنیا کا ایک نظام چل رہا ہے؛ لیکن آج تک ایک آدمی بھی آپ کو ایسا نہیں ملے گا، جس کو دیکھ کر آپ یہ کہیں کہ یہ پانچ صدیوں سے، دس صدیوں سے دنیا میں ہے، پانچ ہزار سال ہو گئے یہ ابھی زندہ ہے، ایسا کوئی ہے؟ کوئی ایک آدمی بھی نہیں ہے۔ کُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ. جو بھی اس دنیا میں آیا اس کو جانا ہے۔

اس قانون سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ لوگوں نے بڑے بڑے حقائق کا انکار کیا۔ اللہ کے وجود کا انکار کیا، انبیاءؑ کی نبوت اور رسالت کا انکار کیا، قیامت کا انکار کیا، جنت و دوزخ کا انکار کیا؛ لیکن موت کا آج تک کوئی انکار نہیں کر سکا۔ سب کو اس حقیقت کو تسلیم کرنا پڑا کہ موت تو بہر حال آئے گی، کوئی ایک آدمی بھی ایسا نہیں ہے جو اپنے آپ کو موت سے بچا سکتا ہو۔ سبھی پر موت آنے والی ہے۔

بڑھ رہا ہے قافلہ جانب قضا کے ہر قدم:

اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ کوئی بڑے سے بڑا فلسفی اور بڑے سے بڑا سائنس

دان اور بڑے سے بڑا انجومی کسی کو یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس کی موت کب آئے گی؟ آئے گی یہ حقیقت ہے؛ لیکن کب آئے گی یہ معلوم نہیں ہے۔ ابھی آ سکتی ہے، کل آ سکتی ہے، ایک مہینے کے بعد آ سکتی ہے، ایک سال کے بعد آ سکتی ہے۔ آج تک سائنس دانوں نے کوئی ایسی تدبیر نہیں پائی جس کے ذریعہ سے کون کب تک زندہ رہنے والا ہے؛ یہ معلوم کر سکیں۔ کسی کی کوئی گارنٹی نہیں۔ ہاں! یہ سب تسلیم کرتے ہیں کہ جو آیا ہے اس کو جانا ہے۔ معلوم ہوا یہ دنیا ہمیشہ رہنے کا گھر نہیں ہے۔ یہ منزل نہیں ہے، یہ سفر ہے۔ اگر منزل ہوتی تو دنیا میں ہمیں کچھ لوگ ایسے نظر آتے جو مستقل یہاں رہتے ہوں کہ یہ لوگ جب سے آئے ہیں گئے نہیں ہیں یہ دنیا ہی میں رہتے ہیں، معلوم یہ ہوا کہ دنیا ہمیشہ رہنے کی جگہ نہیں ہے۔

ایک سفر کا سلسلہ ہے۔ دنیا میں کوئی آدمی سفر کرتا ہے، اگر وہ عقلمند اور صاحب ہوش و حواس ہو، تو اس کے سفر کا کوئی نہ کوئی مقصد ہوتا ہے کہ آپ سفر کر رہے ہیں تو کیوں کر رہے ہیں؟ تجارت کے لیے، اپنے اعزہ واقارب کی ملاقات کے لیے، علم حاصل کرنے کے لیے، حج وعمرہ کرنے کے لیے، سیر وتفریح کرنے کے لیے۔ کوئی ایسا ہے جو سفر میں جا رہا ہو، اس کو پوچھا کہ تم سفر میں کیوں جا رہے ہو؟ کیا مقصد ہے؟ اور وہ یہ کہے کہ مجھے معلوم نہیں میرے سفر کا مقصد کیا ہے؟ اس کو لوگ بے وقوف کہیں گے؛ لیکن یہاں دنیا کا سفر جس کو ہم کر رہے ہیں ہمیں پوچھا جاتا ہے کہ تمہارا مقصد کیا ہے؟ تو ہم اپنے مقصد سے غافل ہیں۔

اصل مقصد:

جس ذات نے ہمیں پیدا کیا، اور اس نے ہم کو اس دنیا کے سفر پر بھیجا، اس نے ہمیں کھول کھول کر بتلا دیا کہ تم کو دنیا میں کیوں بھیجا گیا ہے؟ وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَ الْاِنْسَ اِلَّا

لِيَعْبُدُوْنِ. (الذّٰريٰت:۵۶) بندگی کرنے کے لیے، یعنی تم اپنی زندگی ہماری مرضی کے مطابق گزارو۔ تمہاری خواہشات کو، تمہاری سوچ کو، تمہاری مرضی کو اس زندگی میں دخل نہیں ہے۔ تمہیں زندگی ہماری مرضی کے مطابق گزارنی ہے، ہم جس طرح کہیں اس طرح کرو، جن چیزوں سے بچنے کا حکم کریں اس سے بچو۔ یہ باری تعالیٰ نے کھول کھول کر بتلا دیا ہے۔ گویا دنیا کے اس سفر کا مقصد بھی اس سفر پر بھیجنے والے نے بالکل صاف اور واضح کر دیا؛ لیکن جب اس دنیا میں آئے ہیں تو قدرت کی طرف سے ہی ہماری کچھ طبعی ضرورتیں ہمارے ساتھ لگا دی گئی ہیں۔ کھانا، پینا، راحت، آرام۔ اور ان ضرورتوں کو پورا کیے بغیر آدمی سکون نہیں پا سکتا ہے۔ کھانے کی ضرورت پیش آئے تو اس کو پورا کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے کچھ کام کاج، کاروبار کرنے کی اجازت دی گئی؛ لیکن وہ بقدرِ ضرورت۔ اصل مقصد تو یہ ہے کہ ہم اپنی زندگی کو اللہ کے حکم کے مطابق اس کی بندگی میں گزاریں، اس کے بندے بن کر رہیں، اس کی مرضی کے مطابق چلیں۔ جن کاموں کا حکم دیا ہے ان کو کریں، جن سے بچنے کو کہا ہے ان سے بچیں۔ اصل تو یہی ہے۔

اِن کو مرنے پہ ہی جینے کا پتہ چلتا ہے:

لیکن اس دنیا کی طلب میں لوگ ایسے کھو گئے کہ انہوں نے اپنی زندگی کے مقصد کو بھلا دیا، یہاں کیوں آئے ہیں؟ اپنے سفر کے اس مقصد کی طرف سے بالکل غافل ہو گئے۔ اور ایسے غافل، اور دنیا کی طلب میں ایسے مشغول ہو جاتے ہیں، کہ دنیا سے جانے کا وقت آ جاتا ہے، موت آ جاتی ہے وہاں تک یہ غفلت دور نہیں ہوتی۔ مرے، قبرستان پہنچے، اب اگر خیال آتا بھی ہے تو کیا؟ مقصدِ زندگی کو پورا کرنے میں جو غفلت اور کوتاہی ہوئی ہے، اس کی

تلافی کا اب وقت نہیں رہا ہے۔ اسی کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس سورت میں بتلایا ہے۔

ترجمہ اور وضاحت:

اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ. (ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر دنیا کا عیش حاصل کرنے کی ہوس نے تم کو غفلت میں ڈال دیا)۔ یعنی اس کو حاصل کرنے میں تم ایسے مشغول ہو گئے کہ دنیا میں کیوں آئے ہو؟ تمہیں دنیا میں کیا کرنا ہے؟ تمہارے آنے کا مقصد کیا ہے؟ اس کی طرف سے تم غافل ہو گئے۔ آدمی نے اپنے مقصد زندگی کو بھلا دیا۔

حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ. (یہاں تک کہ تم قبرستان تک پہنچ جاتے ہو) یعنی یہ غفلت بھی ایسی کہ موت تک ختم ہونے کا نام نہیں لیتی۔ مرنے کے بعد قبرستان پہنچ گئے۔ اب اگر غفلت دور ہو تو بھی کیا فائدہ؟

كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ. (ہرگز ایسا نہیں کرنا چاہیے، تمہیں عنقریب پتہ چل جائے گا) یعنی ایسی غفلت میں پڑنا نہیں چاہیے۔ اپنی زندگی کے مقصد کو بھلانا نہیں چاہیے۔ یعنی جب موت آئے گی اور قبر میں پہنچو گے تب تم کو پتہ چل جائے گا۔

ثُمَّ كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ. (پھر سن لو! یعنی ہرگز تم کو ایسا کرنا نہیں چاہیے، تمہیں عنقریب پتہ چل جائے گا)۔ جب میدان حشر میں پہنچو گے تب پتہ چل جائے گا۔ قبر میں جانا ہے، میدان حشر میں پہنچنا ہے یہ دور نہیں ہے۔ یہ قریب ہے۔ کل ما هو آت قريب. (جو آنے والی چیز ہے وہ قریب ہی ہے)[۱] ابھی ہمیں دور نظر آتی ہے؛ لیکن حقیقت میں دور نہیں ہوتی، وقت گزر جاتا ہے۔

---

(۱) روى البيهقي فى الأسماء والصفات عن ابن شهاب مرسلاً: ۲/ ۳۳۶، ط: مكتبة السوادي، جدة.

كَلَّا لَوْ تَعْلَمُوْنَ عِلْمَ الْيَقِيْنِ. (ہرگز نہیں! اگر تم یقینی علم کے ساتھ یہ بات جانتے) تمہیں اس بات کا یقین ہوتا کہ ہمیں آخرت میں جانا ہے تو کبھی بھی ایسی غفلت سے کام نہ لیتے، ان چیزوں میں مشغول نہ ہوتے۔

لَتَرَوُنَّ الْجَحِيْمَ. (ضرور بالضرور تم دوزخ کو دیکھو گے) یعنی موت کے بعد جب میدان حشر میں پہنچیں گے، تو باقاعدہ دوزخ لائی جائے گی، اور سب لوگ دوزخ کی زیارت کریں گے، اس کو دیکھیں گے۔

ثُمَّ لَتَرَوُنَّهَا عَيْنَ الْيَقِيْنِ. (اور پھر یقین جانو! کہ تم اسے بالکل یقین کے ساتھ دیکھ لو گے)۔

عین الیقین اور حق الیقین:

عین الیقین کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ کسی چیز کے متعلق کوئی معتبر آدمی خبر دے تو اس کا علم اور جانکاری یقینی ہوتی ہے، پھر اگر اسی چیز کو ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں، تو اس کو عین الیقین کہتے ہیں۔ اور اس کا تجربہ بھی ہو جائے تو اس کو حق الیقین کہتے ہیں۔ جیسے کوئی آدمی ہمیں یوں کہے کہ آگ جلاتی ہے۔ کہنے والا ہمارے نزدیک معتبر ہے، وہ جب یوں کہے گا کہ آگ جلاتی ہے تو اس کے کہنے سے ہمیں ایک علم حاصل ہوا۔ اس کے بعد ہم نے دیکھا کہ آگ نے ہمارے سامنے کسی کو باقاعدہ جلا بھی دیا، تو جو ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا وہ عین الیقین کہلائے گا۔ اس کے بعد پھر کسی نے ہماری انگلی آگ میں ڈال دی، یا ہم پر کسی نے آگ ڈال دی اور اس کی وجہ سے ہم کو جلنے کا احساس ہوا، تو اس کو حق الیقین کہتے ہیں۔ باری تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جب تم باقاعدہ اپنی آنکھوں سے دیکھو گے تو تمہیں اس کا عین

الیقین حاصل ہوجائے گا۔ کہ تم جہنم کو دیکھو گے، یعنی صرف علم اور جانکاری نہیں؛ بلکہ تم اس کی حقیقت کو دیکھو گے۔

ثُمَّ لَتُسْـَٔلُنَّ يَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِيمِ. (پھر تم اس دن نعمتوں کے بارے میں سوال کیے جاؤ گے) یعنی قیامت کے روز اللہ تعالیٰ کی طرف سے، اللہ کی نعمتوں کے متعلق پوچھا جائے گا۔ تم نے اللہ کی جو نعمتیں استعمال کی ہیں اللہ تعالیٰ کو اس کا باقاعدہ حساب دینا پڑے گا۔

تیرا مال تو وہی ہے.......:

حضرت عبداللہ بن شخیرؓ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا، تو میں نے سنا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سورۂ تکاثر کی تلاوت فرما رہے ہیں، جب تلاوت پوری کر چکے، تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: يقول ابن أدم: مالي مالي (انسان کہتا ہے کہ میرا مال، میرا مال) تیرا مال تو وہی ہے جو تو نے کھا کر کے ختم کر دیا، یا پہن کر کے پرانا کر دیا، یا اللہ کے راستے میں خرچ کر کے اپنے لیے آخرت میں جمع کرا دیا۔ باقی سب کچھ دوسروں کا ہے، وہ ختم ہونے والا ہے۔[۱] آدمی یوں سمجھتا ہے کہ میرا مال؛ لیکن جب موت آتی ہے تب یہیں چھوڑ کر چلا جاتا ہے، وہ دوسروں کے ہاتھ میں چلا جاتا ہے۔ تب پتہ چلتا ہے کہ پوری زندگی سب کو یہ کہتا رہا کہ میرا مال، اس کا کچھ نہیں تھا، وہ تو صرف اس کا چوکیدار تھا، مال تو دوسرے کے پاس گیا، یہ تو اس کی حفاظت کرتا رہا۔ اپنا تو وہی ہے جو خود کھا کر ختم کرے، یا پہن کر پرانا کر لے یا اللہ کے راستے میں خرچ کر کے اپنے لیے آخرت میں جمع کر لے۔

---

(۱) المستدرک علی الصحیحین: ۳۹۲۹، ط: دار الکتب العلمیة، بیروت.

اس کا منہ قبر کی مٹی ہی بھر سکتی ہے:

اسی طرح بخاری شریف میں حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت ہے: نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے: آدمی دنیا حاصل کرنے میں ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر آگے بڑھنے کی کوشش کرتے ہیں، انسان کو اگر ایک وادی (وادیاً) (دو پہاڑیوں کے درمیان کی ہموار زمین) سونے سے بھری ہوئی مل جائے تو أحب أن يكون له واديان. ایک پر اس کو صبر نہیں ہوتا، وہ چاہتا ہے ایسی دو وادیاں مل جائیں۔ حالاں کہ یہ ایک وادی جو سونے سے بھری ہوئی ہے اس کی کئی نسلوں تک کام دے سکتی ہے؛ لیکن آدمی یہ سوچ سکتا ہے کہ اس وقت میرے پاس جو مال ہے میری کئی پیڑھیاں اس سے اپنی ضرورتیں پوری کر سکتی ہیں، پھر مجھے اب دوسرا مال حاصل کرنے کی ضرورت نہیں ہے؛ لیکن نہیں! اس کی حرص کی کوئی انتہا نہیں ہے۔ ولن يملأ فاه إلا التراب. (اور آدمی کا منہ تو قبر کی مٹی ہی بھرتی ہے) دوسرا کوئی نہیں بھرتا۔ ويتوب الله على من تاب، ہاں آدمی توبہ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی توبہ قبول کرتے ہیں۔ گویا آدمی کے حرص کی کوئی انتہا نہیں۔[1]

حرص کی انتہا نہیں:

ایک آدمی کی ضرورت ہوتی ہے، وہ تو بہت کم سے پوری ہو جاتی ہے۔ ایک آدمی پیاسا ہے، پیاس کو ختم کرنے کے لیے ایک گلاس پانی کافی ہے، سیراب ہو جائے گا۔ بھوکا ہے، اس کی بھوک کو دور کرنے کے لیے دو یا تین روٹیاں کافی ہیں، شکم سیر ہو جائے گا۔ لیکن اگر ہوس اور حرص ہے، جیسے لوگوں کو مال اور دولت کی حرص پیدا ہو جاتی ہے اس کی تو کوئی انتہا

---

(۱) صحيح البخاري: ۶۴۳۹.

ہی نہیں ہے۔ جتنا آتا ہے وہ کم ہے۔ یہی نعرہ لگاتا ہے کہ هل من مزيد؟ مجھے اور مل جائے۔ اور اس کی یہ حرص ختم ہی نہیں ہوتی ہے۔

غفلت کو دور کرنے کی ضرورت ہے:

مال اور جاہ دونوں کا یہی حال ہے۔ یعنی رتبہ حاصل کرنے کی ہوس۔ اسمبلی کا ممبر (ધારાસભ્ય) بن گیا، تو پھر آگے یوں تمنا کرے گا کہ وزیر (પ્રધાન) بن جاؤں۔ وزارت مل گئی، تو پھر یوں سوچے گا کہ میں وزیر اعلیٰ (મુખ્ય પ્રધાન) بن جاؤں۔ اور جب وزیر اعلیٰ (મુખ્ય પ્રધાન) بن گیا، تو پھر یوں سوچے گا کہ میں وزیر اعظم (વડા પ્રધાન) بن جاؤں۔ گویا اس کی حرص اور طمع کی کوئی انتہا نہیں ہوگی، وہ سلسلہ آگے چلتا ہی رہتا ہے۔ اور اسی حرص اور طمع کو حاصل کرنے میں زندگی ختم ہو جاتی ہے، قبر میں پہنچ جاتا ہے اور اس کو خیال بھی نہیں رہتا۔ پوری زندگی یہی غفلت طاری رہتی ہے۔ اسی کو اللہ تعالیٰ دور کرنا چاہتے ہیں کہ ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر عیش وعشرت اور راحت، دولت وثروت حاصل کرنے نے تم کو آخرت کی طرف سے غفلت میں ڈال دیا ہے، اپنی اس غفلت کو دور کرنے کی ضرورت ہے، اسی پر تنبیہ کی گئی کہ تم کو قبر میں جانا ہے، حشر میں جانا ہے، جب وہاں پہنچ جاؤ گے تو پتہ چلے گا؛ لیکن وہاں پہنچنے کے بعد تمہارے لیے اس کی تلافی کا کوئی موقع نہیں رہے گا کہ اب کچھ کر سکیں۔ کر سکنے کا موقع ہاتھ سے نکل گیا۔

تندرستی، ہزار نعمت:

اور پھر اللہ تعالیٰ کے یہاں نعمتوں کے متعلق سوال ہوگا۔ ترمذی شریف میں حضرت ابو ہریرہؓ کی حدیث ہے، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: قیامت کے روز سب سے پہلے بندے

سے جس چیز کا حساب ہوگا وہ اس کی تندرستی ہے۔ باری تعالیٰ کی طرف سے سوال ہوگا کہ کیا ہم نے تم کو تندرستی نہیں دی تھی؟ کیا ہم نے تم کو ٹھنڈا پانی نہیں پلایا تھا؟[۱] اور تندرستی صرف ایک نعمت نہیں ہے، ہزاروں نعمتیں ہیں۔ ہمارے جسم میں تنے اعضا ہیں؟ آنکھ ہماری ٹھیک ہے، کان ہمارے ٹھیک ہیں، زبان ہماری ٹھیک ہے، ناک ہماری ٹھیک ہے، ہاتھ ہمارے ٹھیک ہیں، ہمارا دل کام کررہا ہے، دماغ صحیح ہے، کڈنی کام کررہی ہے، پیر چل رہے ہیں، ہاتھ اپنا کام کررہے ہیں۔ جسم کے بے شمار اعضا ہیں، ہر ہر عضو اپنی ڈیوٹی پوری کررہا ہے، یہ سب کیا ہے؟ تندرستی ہی تو ہے!!! تندرستی کہنے کو تو ایک نعمت ہے؛ لیکن اگر غور کیا جائے تو بے شمار نعمتیں ہیں۔ اس میں سے ذرا آگے پیچھے ہوجائے، جیسے کسی کی کڈنی خراب ہوگئی پھر دیکھو کیا ہوتا ہے؟ دل کا دورہ پڑ گیا، دیکھو کیا ہوتا ہے؟ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ ساری تندرستیاں عطا فرمائی ہیں، وہ کہنے کو تو ایک نعمت ہے؛ لیکن سوچو گے اور گنو گے تو ہزاروں نعمتیں ہیں۔ اسی لیے گجراتی میں ایک کہاوت ہے: ایک تندرستی، ہزار نعمت۔ واقعہ یہی ہے کہ دکھنے میں تو ایک ہے؛ لیکن اللہ تعالیٰ کی بے شمار نعمتیں ہیں۔

کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں:

شمائل میں واقعہ موجود ہے کہ ایک مرتبہ نبی کریم ﷺ اپنے گھر سے دوپہر میں ایسے وقت پر نکلے جو عام طور پر نبی کریم ﷺ کے گھر سے نکلنے کا وقت نہیں تھا، اور کوئی آدمی ملاقات کے لیے بھی اس وقت نہیں جاتا تھا، جب باہر تشریف لائے تو حضرت ابوبکرؓ کی ملاقات ہوگئی کہ کیا بات ہے؟ تو کہا کہ اے اللہ کے رسول! آپ کے دیدار اور آپ کی

---

(۱) سنن الترمذي: ۳۳۵۸.

ملاقات۔اصل میں ان کو فاقہ تھا،اور بھوک سے بے چین ہو کر نکلے تھے؛لیکن نبی کریم ﷺ کے چہرۂ انور کو دیکھ کر وہ اپنی بھوک بھول گئے اور یہ کہا کہ اے اللہ کے رسول ! آپ کی زیارت اور آپ کی ملاقات۔پھر حضرت عمرؓ پہنچ گئے،حضرت عمرؓ کو حضور ﷺ نے پوچھا: اے عمر! کیا بات ہے؟ تو کہا: اے اللہ کے رسول ! بھوک کا احساس ہے۔شدت سے بھوک لگی ہوئی ہے،کھانے کو کچھ نہیں تھا،بے چین ہو کر گھر سے باہر نکلا ہوں۔حضور ﷺ نے فرمایا: میں بھی کچھ بھوک محسوس کر رہا ہوں۔کہا کہ چلو! ابوالہیثم بن التیہان،ایک انصاری صحابی ہیں جو بیعت عقبہ میں شریک ہوئے،اور جن لوگوں کو نبی کریم ﷺ نے نقیب بنایا تھا،یہ ان میں سے ہیں۔باغات والے آدمی تھے،حضور اکرم ﷺ ان کے گھر تشریف لے گئے۔ان کی بیوی سے پوچھا کہ کہاں ہیں؟ تو کہا کہ وہ ٹھنڈا پانی لینے گئے ہیں۔ابھی تو بات ہو رہی تھی اتنے میں وہ پہنچ گئے،دیکھا کہ حضور ﷺ میرے گھر؟ بس کیا کہنا تھا!!! وہ مشکیزہ نیچے رکھا اور لپٹ گئے۔اور کہنے لگے اے اللہ کے رسول ! میرے ماں باپ آپ پر قربان! میری قسمت ایسی کہاں کہ میرے گھر آپ؟ پھر حضور ﷺ کو اپنے باغ میں لے گئے اور چادر بچھا کر ان تینوں حضرات کو وہاں بٹھایا۔اور جلدی سے کھجور کا ایک بڑا خوشہ توڑ کر لائے، اور ان کے سامنے رکھ دیا۔حضور ﷺ نے فرمایا: پورا خوشہ کیوں توڑ کر لائے؟ خوشے میں تو پکی کھجوریں بھی ہوتی ہیں،ادھ پکی ہوئی بھی ہوتی ہیں،کچی بھی ہوتی ہیں۔تو پکی پکی توڑ کر لاتے !!! انہوں نے جواب میں عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول ! میں اس لیے پورا خوشہ توڑ کر لایا کہ لوگوں کی چاہت اور ذوق مختلف ہوتا ہے،کسی کو پکی اچھی لگتی ہیں،کسی کو ادھ پکی اچھی لگتی ہیں،کسی کو کچی کھانے میں لطف آتا ہے،تو میں پورا خوشہ اسی لیے توڑ کر لایا تاکہ آپ کو جیسی پسند ہو وہ کھائیں۔حضور ﷺ نے ان کی اس سوچ کی تعریف فرمائی،دعا دی،

پھر وہ پانی لائے۔

جب ان حضرات نے کھجوریں کھائیں اور پانی پیا تو نبی کریم ﷺ نے فوراً فرمایا:
هذا والذي نفسي بيده من النعيم التي تسئلون عنه يوم القيامة. (اللہ کی قسم! یہ ان نعمتوں میں سے ہے جس کے متعلق قیامت کے روز سوال ہوگا) ظل بارد و رطب طيب و ماء بارد. (ٹھنڈی چھاؤں اور تازہ، عمدہ کھجوریں اور ٹھنڈا پانی)[۱] حالاں کہ یہ چیزیں کئی روز کی بھوک کے بعد ملی تھیں، پھر بھی حضور ﷺ گویا متوجہ کررہے ہیں کہ اللہ کی ان نعمتوں کا سوال ہوگا۔

پانچ سوالات:

ترمذی شریف میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی روایت ہے: لا تزول قدم ابن أدم يوم القيامة من عند ربه حتى يسئل عن خمس. (قیامت کے روز انسان کے قدم اللہ کے حضور سے ہٹ نہیں پائیں گے یہاں تک کہ پانچ چیزوں کے متعلق سوال ہوگا)

عن عمره فيم أفناه. (تم نے اپنی زندگی کہاں ختم کی؟)

وعن شبابه فيم أبلاه. (جوانی کے ان ایام کو کہاں پرانا کیا؟)

و ماله من أين اكتسبه وفيم أنفقه. (مال کے متعلق سوال ہوگا کہ کہاں سے کمایا اور کہاں خرچ کیا؟)

مال کے متعلق دو سوال ہوں گے۔ کن طریقوں سے کمایا؟ ناجائز طریقوں سے تو نہیں کمایا؟ پھر اگر جائز طریقے سے کمایا ہے تو کہاں خرچ کیا؟ جہاں اللہ تعالیٰ نے خرچ کرنے کی اجازت اور حکم دیا ہے وہاں یا دوسری جگہ؟ بعض لوگ حلال طریقے سے کما کر بھی

---

(۱) صحيح مسلم: ۲۰۳۸ والشمائل المحمدية للترمذي: ۳۶۱.

فضول خرچی کرتے ہیں اور ان کو تنبیہ کی جاتی ہے تو یوں کہتے ہیں کہ میں نے حلال طریقے سے کمایا ہے، میرا مال ہے جس طرح چاہوں استعمال کروں۔ نہیں! اللہ تعالیٰ نے جہاں خرچ کرنے کا حکم دیا ہے وہیں خرچ کر سکتے ہیں، دوسری جگہ نہیں۔ اور ضرورت سے زائد بھی نہیں فضول خرچی کی اجازت ہی نہیں ہے۔

پیپر آؤٹ ہو گیا ہے:

وماذا عمل فیما علم؟ اور جو علم حاصل ہوا، دین کی جو جانکاری ملی اس پر تم نے کتنا عمل کیا؟[1] یہ دین کی باتیں جو ہم سنتے ہیں ان کے متعلق بھی سوال ہوگا کہ اس کے سننے کے بعد آپ نے اس پر کتنا عمل کیا؟ گویا سوال پیپر آؤٹ ہو گیا ہے۔ دنیا کے امتحان میں اگر ذمہ داروں کو پتہ چلے کہ سوال پیپر آؤٹ ہوا تھا تو دوسرا امتحان دلواتے ہیں۔ یہاں تو اللہ تعالیٰ نے سوال پیپر پہلے سے آؤٹ کر دیا ہے، جواب وہاں دینا ہے۔ یہاں اگر اس پر عمل کرو گے تو جواب دے سکو گے۔

تین دفتر:

حضرت انس رضی اللہ عنہ کی ایک اور روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: قیامت کے روز جب انسان کو اللہ کے حضور حساب کتاب کے لیے پیش کیا جائے گا تو ساتھ میں تین دفتر (ચોપડે) بھی فرشتے پیش کریں گے۔ (۱) ایک دفتر میں اللہ تعالیٰ کی ان نعمتوں کا تذکرہ ہوگا جو اس نے زندگی بھر استعمال کی ہوں گی۔ ہم پیدا ہوئے تب سے لے کر مرنے تک کتنے گلاس پانی پیا؟ ہمیں تو حساب بھی معلوم نہیں ہے۔ کتنی سانس لی؟ ہوا کے ذریعے ہم نے

---

(۱) أخرجه الترمذي برقم: ۲۴۱۶.

سانس لی تھی، اور اپنی زندگی باقی رکھی تھی۔ اللہ تعالیٰ کی ہوا کو سانس میں لینے میں کتنا استعمال کیا؟ سورج کی کتنی روشنی استعمال کی؟ پیدا ہونے سے لے کر موت تک اللہ تعالیٰ کی جتنی بھی نعمتیں بندہ استعمال کرتا ہے وہ سب اس دفتر میں درج ہوں گی۔ چھوٹی چھوٹی نعمتیں بھی ہوں گی۔ (٢) دوسرے دفتر میں اس کے نیک اعمال کا تذکرہ ہوگا۔ اس نے پوری زندگی کتنی نمازیں پڑھیں؟ کتنے روزے رکھے؟ کتنے حج اور عمرے کیے؟ کتنے قرآن ختم کیے؟ کتنی تسبیحات پڑھیں؟ زندگی بھر کے سارے نیک کام اس دفتر میں درج ہوں گے۔ (٣) تیسرے دفتر میں اس کے گناہوں کا تذکرہ ہوگا۔ یہ تین دفتر ہوں گے۔ اور انسان کو فرشتے اللہ کے سامنے پیش کر دیں گے کہ اس کا حساب لے لو۔

......ابھی میری قیمت وصول نہیں ہوئی:

اس وقت نعمتوں کے دفتر میں اللہ کی سب سے چھوٹی اور سب سے کم درجے کی جو نعمت ہوگی، اس نعمت سے اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ اس کے نیک اعمال میں سے تو اپنی قیمت وصول کر لے۔ چناں چہ وہ نعمت آگے بڑھے گی اور اس کے سارے نیک اعمال کو لے کر ایک طرف کھڑی ہو جائے گی۔ اور کہے گی: اے میرے رب! تیری عزت کی قسم! اس کے تمام نیک اعمال میں نے لے لیے، پھر بھی ابھی میری قیمت وصول نہیں ہوئی، اور ابھی تو گناہ بھی باقی ہیں اور نعمتیں بھی۔ پس جب اللہ تعالیٰ کسی بندے پر رحم کرنے کا ارادہ کریں گے، تو کہیں گے: اے میرے بندے! میں نے تیری نیکیوں کو دو گنا کر دیا، اور تیری خطاؤں سے درگذر کیا۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: میرا گمان ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: (اللہ تعالیٰ فرمائیں گے)

میں نے اپنی نعمتیں تجھے (بغیر کسی عملِ صالح کے) ہبہ کر دیں۔[1] اللہ کی ایک ایک نعمت ایسی ہے کہ ہماری پوری زندگی کی عبادتیں اس نعمت کی قیمت ادا نہیں کر سکتیں۔

میرے فضل سے جنت میں جا:

حضرت قاری محمد طیب صاحبؒ کے خطبات میں یہ قصہ ہے، اور حضرت کی زبانی میں نے خود بھی سنا ہے (حضرت جابر بن عبد اللہؓ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ ہمارے پاس تشریف لائے اور فرمایا: ابھی میرے خلیل حضرت جبرئیل علیہ السلام میرے پاس سے تشریف لے گئے اور کہا کہ اے محمد! اس ذات کی قسم جس نے آپ کو حق لے کر مبعوث کیا) کہ بنو اسرائیل میں ایک آدمی تھا، اس نے پانچ سو (۵۰۰) سال سمندر میں ایک پہاڑ کی چوٹی پر اللہ کی عبادت کی...... وہاں اس کے لیے اللہ تعالیٰ نے پانی کا ایک چشمہ جاری کر دیا، اور انار کا ایک درخت اگا دیا۔ چناں چہ وہ اس سے اپنی بھوک و پیاس پوری کرتا تھا، پھر اس نے تمنا کی کہ میری موت اس حالت میں آئے کہ میں سجدے میں ہوؤں؛ تا کہ اسی حالت میں رہوں۔ چناں چہ اسی حالت میں موت بھی آئی۔ مرنے کے بعد جب اسے اللہ تعالیٰ کے حضور پیش کیا جائے گا، تو اللہ تعالیٰ فرشتوں سے کہیں گے کہ میرے فضل سے اس کو جنت میں لے جاؤ۔ تو وہ کہے گا: میرے رب! میرے عمل کی وجہ سے جنت میں داخل کیجیے، چناں چہ اللہ تعالیٰ اپنی نعمتوں اور اس کے اعمال میں تقابل کا حکم دیں گے، تو صرف بصارت

---

(۱) الآثار لأبي يوسف: ۱/ ۲۰۴ [۹۱۵] (ط: دار الکتب العلمیة) و مسند البزار: ۱۳/ ۹۹ [۶۴۶۲] (ط: مکتبة العلوم و الحکم، المدینة المنورة) و المجالسة وجواهر العلم للدینوري المالکي: ۱/ ۲۹۱ [۵] (ط: جمعیة التربیة، بحرین و دار ابن حزم، بیروت) و مسند أبي حنیفة روایة أبي نعیم: ۱/ ۲۰۲ (ط: مکتبة الکوثر، الریاض) و الترغیب و الترهیب للمنذري: ۵۴۴۹ (ت. إبراهیم شمس الدین).

کی نعمت ہی پانچ سو سال کی عبادت کا احاطہ کرلے گی۔ جب کہ ابھی مکمل جسم کی نعمت کا کوئی حساب نہیں ہوا ہے، پھر اللہ تعالیٰ فرمائیں گے: میرے بندے کو جہنم میں داخل کرو، چناں چہ اسے جہنم کی جانب کھینچا جائے گا، تو وہ کہے گا: اپنی رحمت سے جنت میں داخل کیجیے، پھر اللہ تعالیٰ فرمائیں گے: اس کو میرے سامنے حاضر کرو، چناں چہ اسے اللہ کے حضور پیش کیا جائے گا، اللہ تعالیٰ پوچھیں گے: تجھے کس نے پیدا کیا؟ جب کہ تیرا وجود نہیں تھا، تو وہ کہے گا: میرے رب! تو نے ہی پیدا کیا، پھر اللہ تعالیٰ پوچھیں گے: تجھے پانچ سو سال عبادت کی قوت کس نے دی؟ وہ کہے گا: تو نے ہی اے میرے رب! تجھے سمندر میں پہاڑ پر کس نے ٹھکانہ دیا؟ اور کس نے تیرے لیے شور پانی سے خوش گوار پانی کا انتظام کیا؟ اور کس نے ہر رات تیرے لیے انار کا انتظام کیا؟ حالاں کہ انار درحقیقت سال میں ایک ہی مرتبہ اگتا ہے، پھر تجھے سجدے کی حالت میں موت کس نے دی؟ وہ کہے گا: تو نے ہی اے میرے رب! اللہ تعالیٰ فرمائیں گے: یہ سب میری رحمت کا کرشمہ ہے اور میری رحمت سے میں تجھے جنت میں داخل کرتا ہوں، پھر اللہ تعالیٰ حکم دیں گے کہ میرے بندے کو جنت میں داخل کرو (اور فرمائیں گے) تو بہت اچھا بندہ تھا، پس اللہ تعالیٰ (اپنی رحمت سے) اسے جنت میں داخل کریں گے۔[١]

تو یہاں بھی ان تین دفتروں میں سے نعمت والے دفتر کی چھوٹی نعمت سے اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ تو اپنی قیمت وصول کرلے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں کہ وہ نعمت اس کی زندگی کی ساری عبادتوں کو لے لے گی، اور ایک طرف کھڑی ہو جائے گی۔ باری تعالیٰ اس سے پوچھیں گے کہ کیا بات ہے؟ تو وہ کہے گی کہ میں نے اس کی ساری عبادتیں لے لی ہیں، پھر

---

(١) رواه الحاكم في المستدرك في كتاب التوبة والإنابة: ٧٦٣٧ (ط: دار الكتب العلمية، بيروت).

بھی میری قیمت وصول نہیں ہوئی ہے۔ وہ آدمی سوچے گا کہ مَرے۔ ابھی تو ایک چھوٹی سے چھوٹی نعمت کی قیمت ادا نہیں ہوئی۔ زندگی بھر باقی ساری نعمتیں استعمال کیں ان کا کیا ہوگا؟ اوراب عبادتیں تو ختم ہو گئیں !!!! اب تو گناہ رہ گئے !!! اب تو جہنم میں جانے کا موقع آئے گا!! باری تعالیٰ اپنے جس بندے پر اپنا فضل کرنا چاہیں گے، اس سے فرمائیں گے کہ جا! میں نے تیری نیکیاں ڈبل کردیں، اور میں تجھ سے اپنی نعمتوں کا حساب نہیں لیتا، اور میں نے تیرے گناہ معاف کردیے۔ اس کا بیڑا پار ہو جائے گا۔

خلاصۂ کلام:

کہنے کا حاصل یہ ہے کہ قیامت کے روز ان نعمتوں کا سوال ہوگا۔ ہم ان نعمتوں کو بے دردی کے ساتھ اور غفلت کے ساتھ استعمال کرتے ہیں کہ کبھی بھول سے بھی خیال نہیں آتا کہ ہمیں کل کو ان کا جواب دینا پڑے گا۔

اس سورت میں باری تعالیٰ نے ہم جو دنیا کی غفلت میں پڑے ہوئے ہیں اس کا علاج بتلایا ہے۔ علاج میں دو چیزیں ہیں: (۱) جہنم کا خوف (۲) اللہ کی نعمتوں کے حساب کا یقین۔ اگر آدمی دل میں اس بات کا یقین رکھتا ہو کہ مجھے اللہ کی ان نعمتوں کا کل اللہ کو جواب دینا ہے، اور جہنم پر پیش ہونا ہے تو کبھی بھی وہ غفلت میں نہیں رہے گا۔ ہمیں اپنی زندگی کی غفلت کو دور کرنے کی ضرورت ہے، ہمیں اس کا استحضار ہو۔ ہم دنیا کی یہ زیادتی حاصل کرنے کے لیے جو دوڑ لگا رہے ہیں؛ حالاں کہ ہماری ضرورتیں تو اس سے کم میں پوری ہو جاتی ہیں، تو ضرورت ہے کہ ہم اپنے آپ کو اس سے بچائیں۔ یہی اس سورت کا سبق ہے۔

اللہ ہم سب کو توفیق عطا فرمائے۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

سورۂ قارعة

(قسط-۱)

(مؤرخہ: ۷/ربیع الآخر ۱۴۴۰ھ-مطابق: ۱۵/دسمبر ۲۰۱۸ء، شب یک شنبہ)

الحمد لله نحمده ونستعينه ونستغفره ونؤمن به ونتوكل عليه ونعوذ بالله من شرور أنفسنا ومن سيئات أعمالنا ونعوذ بالله من شرور أنفسنا ومن سيئات أعمالنا من يهده الله فلا مضل له ومن يضلله فلا هادي له ونشهد أن لا إلٰه إلا الله وحده لا شريك له ونشهد أن سيدنا و مولانا محمداً عبده ورسوله أرسله إلى كافة الناس بشيراً ونذيراً وداعياً إلى الله بإذنه وسراجاً منيراً صلى الله تعالى عليه وعلى آله وأصحابه وبارك وسلم تسليماً كثيراً.

أما بعد! فأعوذ بالله من الشيطٰن الرجيم ○ بسم الله الرحمٰن الرحيم ○

اَلۡقَارِعَةُ ۙ﴿۱﴾ مَا الۡقَارِعَةُ ۚ﴿۲﴾ وَ مَاۤ اَدۡرٰىكَ مَا الۡقَارِعَةُ ؕ﴿۳﴾ يَوۡمَ يَكُوۡنُ النَّاسُ كَالۡفَرَاشِ الۡمَبۡثُوۡثِ ۙ﴿۴﴾ وَ تَكُوۡنُ الۡجِبَالُ كَالۡعِهۡنِ الۡمَنۡفُوۡشِ ؕ﴿۵﴾ فَاَمَّا مَنۡ ثَقُلَتۡ مَوَازِيۡنُهٗ ۙ﴿۶﴾ فَهُوَ فِىۡ عِيۡشَةٍ رَّاضِيَةٍ ؕ﴿۷﴾ وَ اَمَّا مَنۡ خَفَّتۡ مَوَازِيۡنُهٗ ۙ﴿۸﴾ فَاُمُّهٗ هَاوِيَةٌ ؕ﴿۹﴾ وَ مَاۤ اَدۡرٰىكَ مَا هِيَهۡ ؕ﴿۱۰﴾ نَارٌ حَامِيَةٌ ﴿۱۱﴾

وجہ تسمیہ:

یہ سورۂ القارعة ہے، اس کا پہلا ہی کلمہ القارعة ہے، اس لیے اس کو القارعة سے موسوم کیا گیا۔

قرآن پاک کے آخری دو پاروں (۲۹ /اور ۳۰) کی اکثر سورتوں میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے قیامت کے خوفناک حالات کا تذکرہ کیا ہے، قیامت آئے گی اور وہ کس طرح آئے گی؟ پھر جنت کا، جنت کی راحتوں کا، جہنم کا، جہنم میں ہونے والے عذاب کا بڑا تفصیلی تذکرہ فرمایا ہے۔

جرائم ومظالم سے روکنے والی:

آخرت کا فکر ہی ایک ایسی چیز ہے جو دنیا میں آدمی کو اللہ کے حکم کے مطابق چلنے پر آمادہ کرنے والا ہے۔ اگر دل ودماغ پر یہ فکر چھا جائے کہ مجھے اللہ تبارک وتعالیٰ کے سامنے پیش ہونا ہے اور اپنے اعمال کا جواب دینا ہے، تو پھر اس کی زندگی شریعت کے مطابق گزرتی ہے۔ قرآن یہ چاہتا ہے کہ آدمی کے دل ودماغ پر آخرت کا فکر غالب ہو۔ یہی وہ چیز ہے جو آدمی کو جرائم اور مظالم سے روکنے والی ہے۔

غفلت؛ جرائم ومظالم کا اصل محرک:

دنیا میں جرائم اور مظالم کا سلسلہ کیوں ہے؟ لوگوں نے اس کے اسباب کے متعلق بڑی فلسفیانہ باتیں پیش کی ہیں۔ بعض لوگ یوں کہتے ہیں کہ ان جرائم کی اصل وجہ جہالت ہے۔ اگر تعلیم کو عام کیا جائے تو جرائم کا سلسلہ بند ہوسکتا ہے۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا کے وہ ممالک جہاں صد فی صد تعلیم ہے، وہاں بھی اسی طرح جرائم ہورہے ہیں جیسے دوسرے ممالک میں۔ اگر ان جرائم کی وجہ جہالت اور تعلیم کا فقدان ہوتا، تو وہاں سے جرائم کا خاتمہ ہوجانا چاہیے تھا؛ لیکن ایسا نہیں ہے۔

بعض حضرات جرائم کی وجہ ”غربت“ کہتے ہیں۔ غربت کی وجہ سے آدمی مال حاصل

کرنے کے لیے نئے نئے طریقے اپناتا ہے، جرائم کا ارتکاب کرتا ہے، مظالم کا شکار ہوتا ہے۔ اگر غربت کو ختم کر دیا جائے تو جرائم کا خاتمہ ہو جائے گا۔ جن ممالک کی انفرادی آمدنی فی صد کے اعتبار سے سب سے زیادہ ہے، وہاں اِن جرائم میں کوئی کمی نہیں؛ بلکہ دوسرے ممالک کے مقابلے میں وہاں جرائم کی مقدار زیادہ ہے۔ معلوم ہوا کہ غربت بھی جرائم کا اصل سبب نہیں ہے۔

اصل سبب آدمی کا آخرت کو بھلا دینا ہے۔ آدمی کی طبیعت پر آخرت کی جانب سے جو غفلت غالب آجاتی ہے اس کے نتیجے میں وہ ان ساری برائیوں کا مرتکب ہوتا ہے۔ اگر کسی کے دل میں آخرت کا خوف ہو، آخرت کا فکر ہو، دل ودماغ پر یہی چیز غالب ہو کہ مجھے مرنے کے بعد اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش ہونا ہے، اپنے کرتوت اور اعمال کا جواب دینا ہے، تو وہ چیز آدمی پر بندش لگاتی ہے اور پہرہ بٹھاتی ہے۔ اور اس طرح یہ فکر آدمی کو غلط کام کرنے سے، جرائم ومظالم، بدعنوانیوں وبداخلاقیوں کے ارتکاب سے بچالیتی ہے۔ اگر آدمی زیادہ پڑھا ہوا نہیں ہے، ان پڑھ ہے؛ لیکن اس کے دل میں آخرت کا فکر ہے تو یہی چیز اس کو تنہائیوں میں بھی گناہ اور ظلم کا ارتکاب کرنے سے روکے گی۔

فأين الله . . . فأين الله:

حضرت عبداللہ بن عمرؓ ایک مرتبہ مکہ مکرمہ کی جانب سفر کر رہے تھے، راستے میں ایک جگہ آپ نے شب باشی کی، وہاں ایک چرواہا پہاڑ سے آپ کے پاس آیا، آپ نے اس سے پوچھا کہ تیرے پاس بکریاں ہیں؟ اس نے کہا: جی! آپ نے فرمایا: ایک بکری مجھے بیچ دے، وہ کہنے لگا: میں غلام ہوں (یہ بکریاں میرے آقا کی ہیں) آپ نے فرمایا: آقا سے

کہہ دینا کہ بھیڑیا بکری کھا گیا، تو وہ غلام چرواہا کہنے لگا: فأين الله؟؟؟ (کیا یہ بات اللہ سے مخفی رہ سکتی ہے) حضرت عبداللہ بن عمرؓ یہ جملہ دہراتے رہتے تھے: فأين الله...... فأين الله...... اور بعض روایات میں ہے کہ آپ نے فرمایا کہ فأين الله تو مجھے کہنا چاہیے تھا، پھر جب آپ مدینہ منورہ لوٹے، تو آپ نے اس کے آقا کو کہلا بھیجا اور غلام خرید لیا، اور بکریاں بھی خرید لیں۔ پھر غلام کو آزاد کر کے ساری بکریاں اسے ہبہ کر دیں۔[1] جب آدمی کے دل میں یہ فکر پیدا ہو جائے، تو چاہے کوئی نگرانی کرنے والا نہ ہو، یہ فکر ہی بہت بڑا پہرہ ہے جو اس کو ہر قسم کے گناہوں اور بداخلاقیوں سے، مظالم سے، جرائم سے روک سکتا ہے۔ وہاں کسی دوسری تعلیم کی ضرورت نہیں کہ جس کا اس کے پاس سرٹیفکیٹ ہو۔ اور غربت کی حالت میں بھی یہ فکر ہی روکے گی۔ اس چرواہے کے پاس کون سا مال تھا؟ غربت کی حالت میں بھی وہ آدمی اپنے آپ کو ان چیزوں سے بچاتا ہے۔

منزل بر...... ناپائیدار:

اسی لیے اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں آخری دونوں پاروں کی اکثر سورتوں میں قیامت کا تذکرہ کیا ہے۔ اس میں یہ بتایا گیا کہ اللہ نے ہمیں جو دنیا کی زندگی عطا فرمائی ہے وہ دائمی نہیں ہے، بلکہ دنیا میں آخرت کی تیاری کے لیے چند دنوں کے واسطے بھیجا ہے، آزمائش کے لیے بھیجا ہے۔ تَبٰرَكَ الَّذِیْ بِیَدِهِ الْمُلْكُ وَهُوَعَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرُ ۙ الَّذِیْ خَلَقَ

---

(١) الزهد لأبي داود: ١/ ٢٦٢ [٢٩٣] (ط: دار المشكاة، حلوان) وقصر الأمل لابن أبي الدنيا: ١/ ١٢٨ (ط: دار ابن حزم، بيروت) والمعجم الكبير للطبراني: ١٢/ ٢٦٣ [١٣٠٥٤] (ط: مكتبة ابن تيمية، القاهرة) والشعب الإيمان للبيهقي: ٧/ ٢٢٣ [٤٩٠٨].

نوٹ: امام بیہقیؒ کی شعب الایمان میں یہ واقعہ بالتفصیل قدرے فرق کے ساتھ مذکور ہے۔

الْمَوْتَ وَالْحَیٰوۃَ لِیَبْلُوَکُمْ اَیُّکُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ؕ (الملک:۱،۲) موت اور زندگی اللہ نے اس لیے پیدا کی کہ اللہ آزمانا چاہتے ہیں کہ تم میں کون اچھے اعمال کرنے والا ہے؟ یہ دنیا کی زندگی اسی آزمائش کے لیے ہمیں دی گئی ہے، یہ ہمیشہ رہنے کی جگہ نہیں ہے۔ یہ چیز ہمیشہ مدنظر رکھنی چاہیے کہ اللہ نے ہمیں یہاں زندگی گزارنے کے اسباب بھی دیے، راحت وآرام کی شکلیں بھی دیں؛ لیکن یہ چیزیں ہمیشہ کی نہیں ہیں۔آدمی یہاں آکر آخرت سے غافل ہو کر اس بات کی کوشش میں رہتا ہے کہ میں کسی طرح زیادہ سے زیادہ راحت وآرام کے اسباب مہیا کرلوں، اور زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھالوں۔اور وہ آخرت کی طرف سے غافل ہوجاتا ہے۔ حالاں کہ یہ پتا نہیں کہ دنیا کی یہ زندگی کب تک ہے؟ جو لوگ دنیا سمیٹنے میں پڑے ہوئے ہیں ان کو بھی معلوم نہیں ہے کہ کب موت آجائے گی؟ اس سے پہلے سورۂ تکاثر گذری اس میں زیادہ سے زیادہ مال سمیٹنے کی ہوس نے غافل کردیا اس کا تذکرہ آچکا ہے۔یہی وہ چیز ہے جو آدمی کو غفلت میں ڈالتی ہے، تو اس غفلت کو دور کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ لوگوں کے دلوں میں آخرت کا فکر پیدا ہو۔

ان دونوں پاروں کی سورتیں مکی دور میں نازل ہوئیں۔شروع میں جب اللہ تعالیٰ نے نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ابتدائی وحی نازل فرمائی، لوگوں کو ایمان واسلام کی دعوت دی گئی، ابھی شریعت کے دوسرے تفصیلی احکام نہیں آئے تھے، حلال وحرام کے احکام بھی نہیں آئے تھے لوگوں کے دلوں میں صرف آخرت کے یقین کو مضبوط کیا جارہا تھا، اس وقت یہ سورتیں نازل ہوئیں۔یقین ہی وہ چیز ہے جو آدمی کو ہر قسم کے جرائم سے بچاتا ہے۔اسی لیے ان سورتوں میں اس کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔اور آخرت وقیامت کے اور جنت کے حالات اس کی نعمتوں کی تفصیلات، جہنم کے حالات، اس کے عذاب کی تفصیلات بیان کی گئی ہیں۔

......تو انسان وجانور میں فرق نہیں:

اگر آخرت کا فکر نہ ہو تو انسان اور جانور میں کوئی فرق نہیں رہ جاتا۔ جیسے جانور کھاتے پیتے ہیں، انسان بھی کھاتے پیتے ہیں، جانور بھی پیدا ہوتے ہیں اور مرتے ہیں، انسان بھی پیدا ہوتے ہیں اور مرتے ہیں، گویا زندگی کا کوئی مقصد ہی نہ ہوگا۔ جانوروں کے لیے آخرت کا کوئی حساب کتاب نہیں ہے، ان کے لیے زندگی کا کائی خاص مقصد نہیں ہے؛ لیکن انسان کو تو اللہ تعالیٰ نے اس لیے پیدا کیا ہے کہ وہ آخرت کے لیے اعمال کرے۔ اور اگر آخرت کا فکر نہ ہو تو انسان اور جانور میں کوئی فرق نہیں رہے گا۔ تو اس فکر کو اپنی طبیعت اور اپنے دل ودماغ کے اوپر غالب کرنے کا اہتمام کیا جائے۔

اور ہر کام یہ سوچ کر کیا جائے کہ کل مجھے اللہ کے حضور پیش ہونا ہے، اور اس کام کے متعلق جواب دینا ہے۔ کیا میں اللہ کی جانب سے اس کام کے متعلق کیے جانے والے سوال کا جواب دینے کی پوزیشن میں ہوں؟ یہ سوچ کر کوئی کام کرے گا تو کبھی بھی جرم اور ظلم کا ارتکاب نہیں کرے گا۔ تو گویا سارے جرائم کی بنیاد آخرت سے غفلت ہے۔

ترجمہ:

اَلْقَارِعَةُ (کھڑکھڑانے والی)

مَا الْقَارِعَةُ (کیا ہے وہ کھڑکھڑانے والی) کھٹکھٹانے والی، دل کو دہلانے والی؟

وَ مَآ اَدْرٰىكَ مَا الْقَارِعَةُ (اور تم کو کیا معلوم کہ وہ دل دہلانے والی کیا ہے؟)

يَوْمَ يَكُوْنُ النَّاسُ كَالْفَرَاشِ الْمَبْثُوْثِ. (یہ واقعہ اس دن پیش آئے گا جس دن لوگ پروانوں کی طرح پھیلے ہوئے ہوں گے)

وَتَكُونُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ الْمَنْفُوشِ.(اور پہاڑ دھنی ہوئی رنگین اون کی طرح ہوں گے)

فَأَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِينُهُ.(جس کی ترازوئیں وزنی ہوں گی،یعنی جس کے نیک اعمال زیادہ ہوں گے)

فَهُوَ فِي عِيشَةٍ رَّاضِيَةٍ(تو وہ من پسند زندگی میں ہوگا)

وَأَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِينُهُ(اور جس کے پلڑے ہلکے ہوں گے)

فَأُمُّهُ هَاوِيَةٌ(تو اس کا ٹھکانا ھاویۃ(ایک گہرا گڑھا)ہوگا)

وَمَا أَدْرَاكَ مَا هِيَهْ(تمہیں کیا معلوم کہ وہ کیا ہے؟)

نَارٌ حَامِيَةٌ(وہ دہکتی ہوئی آگ ہے)یعنی جہنم ہے۔

تفسیر:

قرع-یقرع کے معنی کھٹکھٹانے کے ہیں،کھڑکھڑانا۔

عربی زبان کا ایک خاص انداز ہے،ہم اردو میں کما حقہ اس کی تعبیر نہیں کر سکتے۔

جب قیامت آئے گی تو صور پھونکے جانے کی ایک خوفناک آواز پیدا ہوگی،وہ ایسی خطرناک آواز ہوگی کہ اس سے لوگوں کے کلیجے پھٹ جائیں گے۔اس کو القارعة سے تعبیر کیا جاتا ہے،دل دہلانے والی۔یعنی جس کی آواز سن کر دل خوف میں مبتلا ہوجائیں گے،ڈر جائیں گے۔تو القارعة:یعنی یاد کرو قیامت کو جو دل دہلا دینے والا اور کھڑکھڑانے والا ایک واقعہ ہے۔

آگے اس کی تفصیل بیان کررہے ہیں:

کوئی اِدھر کوئی اُدھر:

يَوْمَ يَكُونُ النَّاسُ كَالْفَرَاشِ الْمَبْثُوثِ

بارش کے زمانہ میں آپ نے دیکھا ہوگا کہ روشنی میں پروانے بڑی تعداد میں نکل آتے ہیں۔ اوران کا حال یہ ہوتا ہے کہ کوئی اوپر جارہا ہے، کوئی نیچے جارہا ہے، کوئی دائیں، کوئی بائیں، کوئی ترتیب نہیں ہوتی۔ قیامت کے روز جب انسانوں کو دوبارہ پیدا کیا جائے گا توان کا یہی حال ہوگا کہ کوئی ترتیب نہیں ہوگی۔ دائیں، بائیں، اوپر، نیچے ہر طرف کا رخ کیے ہوئے ہوں گے۔ گویا ان میں بے چینی اور خوف کی سی شکل ہوگی۔

وَتَكُوْنُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ الْمَنْفُوْشِ۔

یعنی اللہ تعالیٰ پہاڑوں کو ریزہ ریزہ کردیں گے۔ حالاں کہ پہاڑ اپنی سختی میں مشہور ہیں۔ کسی آدمی کی سختی میں مثال دینی ہو تو پہاڑ کے ساتھ تشبیہ دی جاتی ہے۔ مثلاً: کوئی آدمی مشکلات برداشت کرنے میں بڑا صبر اور تحمل کا مظاہرہ کرتا ہے، تو لوگ کہتے ہیں کہ اس میں پہاڑ کی طرح استقامت ہے۔ لیکن ان ہی پہاڑوں کو اللہ تعالیٰ قیامت کے روز بالکل دھنی ہوئی اون کی طرح بنادیں گے۔ اس کے ذرات ہوامیں اڑ رہے ہوں گے۔

خطرناک واقعہ:

ایک جگہ باری تعالیٰ فرماتے ہیں: وَّهِيَ تَمُرُّ مَرَّ السَّحَابِ۔(النمل:۸۸) جیسے بدلیاں فضا میں ادھر سے اُدھر چلتی ہیں، اس طرح پہاڑ بھی چل رہے ہوں گے، فضا میں اڑ رہے ہوں گے۔ دوسری جگہ فرماتے ہیں: وَيَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْجِبَالِ فَقُلْ يَنْسِفُهَا رَبِّيْ نَسْفًا۔ (طہ:۱۰۵) (یہ لوگ پہاڑ کے متعلق سوال کرتے ہیں، آپ کہیے: میرا رب ان کو پیس کر کے رکھ دے گا) یہ سارے پہاڑ قیامت میں پیسی ہوئی ریت کی طرح ہوجائیں گے، اور دھنے ہوئے اون کی طرح اڑتے ہوں گے، گویا زمین بالکل سپاٹ ہوجائے گی۔ اسی کو آگے کہا گیا: فَيَذَرُهَا قَاعًا

صَفْصَفًا. (طٰہٰ:۱۰۷) اب زمین سپاٹ ہو جائے گی۔ جب پہاڑوں کا یہ حال ہوگا تو اندازہ لگا سکتے ہیں کہ کیسا خطرناک واقعہ پیش آئے گا؟ اس موقع پر کیا ہوگا؟

فَاَمَّا مَنۡ ثَقُلَتۡ مَوَازِيۡنُهٗ. موازین، میزان کی جمع ہے، بمعنیٰ ترازو۔ یعنی جس کی ترازوئیں بھاری اور وزنی ہوں گی وہ من پسند زندگی میں ہوگا۔

اللہ تعالیٰ نے ایک مختصر جملے عِيۡشَةٍ رَّاضِيَةٍ میں سب کچھ بیان کر دیا۔ اس دنیا میں کوئی بڑے سے بڑا حکمران ہو، بڑے سے بڑا مالدار ہو، صنعت کار ہو، کسی بڑے سے بڑے ملک کا سربراہ ہو؛ لیکن کوئی بھی آدمی دنیا میں یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ سب کچھ اس کے دل کی خواہش کے مطابق ہو رہا ہے۔ بلکہ بہت سی باتیں وہ ہیں جو اس کے دل کی مرضی کے خلاف ہیں۔ وہ چاہتا کیا ہے اور ہوتا کیا ہے؟ دنیا ہے ہی ایسی جگہ کہ وہاں آدمی کی پسند کے مطابق سب کچھ ہوتا نہیں ہے۔ بہت سی باتیں اس کی پسند کے خلاف ہوتی ہیں۔ تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جن کی ترازوئیں، جن کے نیک اعمال غالب ہوں گے، وہ قیامت کے روز من پسند زندگی میں ہوں گے۔ یعنی ان کو اللہ تعالیٰ جنت میں بھیجیں گے۔

جنت کا حال:

حدیث شریف میں حضور ﷺ کا ارشاد ہے جنت میں ایسی نعمتیں ہیں: ما لا عين رأت ولا أذن سمعت ولا خطر على قلب بشر. (ایسی نعمتیں جن کو نہ کسی آنکھ نے دیکھا، نہ کسی کان نے سنا، نہ کسی کے دل میں اس کا خیال گزرا)[1] اور قرآن میں باری تعالیٰ فرماتے

---

(۱) مسند الحميدي: ۷۷۹، ۱۱۶۷ (ط: دار السقاء، دمشق، سوريا) ومسند أحمد: ۹۶۴۹، ۲۲۸۲۶ (ط: مؤسسة الرسالة) و صحيح البخاري: ۳۲۴۴، ۴۷۷۹، ۴۷۸۰ (ت. محمد فؤاد عبد الباقي) وصحيح مسلم: ۳۱۲ [۱۸۹]، ۴، ۲، ۵ [۲۸۲۴] (ت. محمد فؤاد عبد الباقي) وسنن الترمذي: ۳۱۹۷، ۳۲۹۲ (ط: مكتبة الحلبي، مصر).

ہیں: وَ لَکُمۡ فِیۡہَا مَا تَشۡتَہِیۡۤ اَنۡفُسُکُمۡ وَ لَکُمۡ فِیۡہَا مَا تَدَّعُوۡنَ. (حم السجدۃ:۳۱) (تمہارا جی جو چاہے گا ایسی من پسند چیزیں وہاں ملیں گی) دنیا میں کوئی آدمی یہ دعویٰ نہیں کرسکتا کہ جو اس کا من چاہتا ہے وہ مل جاتا ہے۔ جنت میں جو مانگو گے اللہ تعالیٰ کی طرف سے سب دیا جائے گا۔

دنیا کی زندگی ایسی ہے کہ یہاں کی راحت کے ساتھ تکلیف لگی ہوئی ہے، یہاں کی خوشی کے ساتھ غم کا کانٹا لگا ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے دنیا کی بناوٹ ہی ایسی رکھی ہے۔ دیکھیے! آپ کھانے بیٹھے ہیں، دسترخوان پر انواع واقسام کے کھانے چنے ہوئے ہیں۔ کھانا کھا رہے ہیں؛ لیکن آپ کو کھٹکا لگا ہوا ہے کہ کہیں زیادہ مقدار میں کھانا پیٹ میں پہنچ گیا تو بدہضمی ہو جائے گی۔ اس چیز کے کھانے کی وجہ سے کہیں کوئی نقصان اور بیماری نہ ہو جائے۔ اسی طرح ہر نعمت کے ساتھ کوئی نہ کوئی غم اور فکر لگا ہوا ہے۔ اور جنت کا حال یہ ہے کہ لَا خَوۡفٌ عَلَیۡہِمۡ وَ لَا ہُمۡ یَحۡزَنُوۡنَ. (یونس:۶۲) (جنتیوں پر نہ تو کوئی خوف ہوگا، نہ ان کو کوئی غم) نہ آئندہ کا کوئی فکر، نہ ماضی کا کوئی غم، وہ ان سب چیزوں سے بے فکر ہوں گے۔ جبکہ دنیا میں آدمی پر یہ ساری چیزیں غالب ہوا کرتی ہیں۔ گویا تم اگر ایسی من پسند زندگی چاہتے ہو تو تم کو جنت میں ملے گی۔ اس کے لیے آپ کو دنیا میں نیک اعمال کا اہتمام کرنا ہے۔ ایسے نیک اعمال جن کی وجہ سے تمہاری ترازوئیں وزنی ہو جائیں۔

من پسند زندگی گزارنے کی جگہ:

دیکھو! دنیا کی تکلیف خالص تکلیف نہیں ہے، اور دائمی تکلیف بھی نہیں ہے۔ جیسے راحت خالص اور دائمی نہیں ہے؛ بلکہ راحت کے ساتھ تکلیف کا بھی کانٹا لگا ہوا ہے۔ اسی طرح تکلیف بھی خالص تکلیف نہیں ہے۔ جیسے کوئی بیماری آ گئی تو اس کا علاج کرنے والا

طبیب موجود ہے، دوائیں موجود ہیں ،آپ کی عیادت کرنے والے آپ کے دوست و احباب موجود ہیں ،خدمت کرنے والے آپ کے رشتہ دار موجود ہیں ۔ اور جہنم میں کوئی پوچھنے والا ہے؟ جہنم میں جو تکلیف ہوگی تو اس تکلیف کا نہ کوئی علاج ہے، نہ اس کی کوئی دوا ہے، نہ وہاں آپ کو کوئی تسلی دینے والا ہے، نہ کوئی آپ کی خبر لینے والا ہے۔ یہاں دنیا میں تو اللہ تعالیٰ نے ان تکلیفوں میں بھی راحت کے سامان مہیا کیے ہیں۔ گویا جہنم کی تکلیف خالص تکلیف ہے۔ اس میں راحت کی کوئی ملاوٹ نہیں ہے۔ اور جنت کی راحت، خالص راحت ہے، اس میں تکلیف کی ملاوٹ نہیں ہے۔ جبکہ دنیا میں دونوں باتیں ہیں: دنیا کی تکلیف نہ خالص تکلیف ہے، اس کے ساتھ راحت کے اسباب ہیں۔ اور دنیا کی راحت نہ خالص راحت ہے؛ بلکہ اس میں تکلیف کی ملاوٹ ہے۔

بہرحال! کوئی آدمی من پسند زندگی دنیا میں تو گزار ہی نہیں سکتا، وہ تو آخرت میں، جنت ہی میں مل سکتی ہے۔ لہٰذا اس کو چاہیے کہ اس کی ترازو وزنی اور بوجھل ہوں اس کا اہتمام کرے۔ کیسے بوجھل ہوں گی؟ وہ آگے ان شاء اللہ بتائیں گے کہ کن اعمال سے ترازو بوجھل بنیں گی؟

اللہ تعالیٰ ہم سب کو توفیق عطا فرمائے۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

سورۂ قارعة

(قسط-۲)

(مؤرخہ: ۲۹/ربیع الآخر، ۱۴۴۰ھ - مطابق: ۵/جنوری ۲۰۱۹ء، شب یک شنبہ)

الحمد لله نحمده ونستعينه ونستغفره ونؤمن به ونتوكل عليه ونعوذ بالله من شرور أنفسنا ومن سيئات أعمالنا ونعوذبالله من شرورأنفسنا ومن سيئات أعمالنا من يهده الله فلامضل له ومن يضلله فلا هادي له ونشهد أن لا إلٰه إلا الله وحده لا شريك له ونشهد أن سيدنا و مولانا محمداً عبده ورسوله أرسله إلى كافة الناس بشيراً ونذيراً وداعياً إلى الله بإذنه وسراجاً منيراً صلى الله تعالى عليه وعلى اٰله وأصحابه وبارك وسلم تسليماً كثيراً كثيراً.

أما بعد! فأعوذ بالله من الشيطٰن الرجيم۝ بسم الله الرحمٰن الرحيم۝

اَلۡقَارِعَةُ ۝۱ مَا الۡقَارِعَةُ ۝۲ وَ مَاۤ اَدۡرٰىكَ مَا الۡقَارِعَةُ ۝۳ يَوۡمَ يَكُوۡنُ النَّاسُ كَالۡفَرَاشِ الۡمَبۡثُوۡثِ ۝۴ وَ تَكُوۡنُ الۡجِبَالُ كَالۡعِهۡنِ الۡمَنۡفُوۡشِ ۝۵ فَاَمَّا مَنۡ ثَقُلَتۡ مَوَازِيۡنُهٗ ۝۶ فَهُوَ فِيۡ عِيۡشَةٍ رَّاضِيَةٍ ۝۷ وَاَمَّا مَنۡ خَفَّتۡ مَوَازِيۡنُهٗ ۝۸ فَاُمُّهٗ هَاوِيَةٌ ۝۹ وَمَاۤ اَدۡرٰىكَ مَا هِيَهۡ ۝۱۰ نَارٌ حَامِيَةٌ ۝۱۱

ترجمہ:

سورۂ القارعة چل رہی تھی، پھر سے ایک مرتبہ اس کا ترجمہ کر دیتے ہیں۔

اَلۡقَارِعَةُ (کھڑکھڑانے والی)

القارعة یہ قیامت کے ناموں میں سے ایک نام ہے۔ جو بھیانک آواز نکلے گی، سب کے دلوں کو جھنجھوڑ کر رکھ دے گی، جس کی وجہ سے دل دہل جائیں گے، اسی کو کھڑ کھڑانے والی فرمارہے ہیں۔

مَا الْقَارِعَةُ (کیا ہے وہ کھڑ کھڑانے والی؟)

وَ مَآ اَدْرٰكَ مَا الْقَارِعَةُ (اور تمہیں کیا معلوم کہ وہ کھڑ کھڑانے والی کیا ہے؟)

يَوْمَ يَكُوْنُ النَّاسُ كَالْفَرَاشِ الْمَبْثُوْثِ (جس دن (اس کی ہیبت کی وجہ سے) تمام لوگ بکھرے ہوئے پتنگوں کی طرح ہوجائیں گے)

وَتَكُوْنُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ الْمَنْفُوْشِ (اور پہاڑ دھنکی ہوئی رنگین اون کی طرح ہو جائیں گے)۔

فَاَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ ، فَهُوَ فِيْ عِيْشَةٍ رَّاضِيَةٍ. (پس! جس شخص کے پلڑے وزنی ہوں گے، وہ من پسند زندگی میں ہوگا)۔

وَ اَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُمُّهٗ هَاوِيَةٌ (اور جس کے پلڑے ہلکے ہوں گے، تو اس کا ٹھکانا ایک گہرا گڑھا ہے)۔

وَ مَآ اَدْرٰكَ مَا هِيَهْ (اور تم کو کیا معلوم کہ وہ گہرا گڑھا کیا ہے؟)

نَارٌ حَامِيَةٌ (دہکتی ہوئی آگ ہے)۔

گذشتہ سے پیوستہ:

بتلایا گیا تھا کہ جن لوگوں کے پلڑے وزنی ہوں گے، وہ اپنی من پسند زندگی میں ہوں گے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قیامت کے روز اعمال کا وزن ہوگا۔ علماء فرماتے ہیں

کہ اعمال کی گنتی نہیں ہوگی کہ کتنے اعمال کیے؟ بلکہ اعمال کا وزن ہوگا۔ باری تعالیٰ فرماتے ہیں: وَنَضَعُ الْمَوَازِيْنَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ ۚ(الانبیاء:۴۷) (ہم قیامت کے روز انصاف کی ترازوئیں قائم کریں گے) جس میں انسانوں کے اعمال کو تولا جائے گا۔ ہم جو عمل کرتے ہیں وہ بظاہر تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابھی عمل کیا اور ختم ہو گیا، مٹ مٹا گیا؛ نہیں! ایسی بات نہیں ہے۔ آدمی جو بھی عمل کرتا ہے وہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے وہاں محفوظ رہتا ہے، اور کل قیامت کے روز باقاعدہ تولا جائے گا۔ ہر عمل کو اللہ نے ایک وزن عطا فرمایا ہے۔ بہت سے اعمال وزنی ہیں، بعض اعمال بغیر وزن کے ہیں۔ یہاں بتلایا جا رہا ہے کہ جن کے اعمال وزنی ہوں گے وہ اپنی من پسند زندگی میں ہوں گے۔

......اب اشکال ختم ہو گیا:

اب اعمال کو کیسے تولا جائے گا؟ قدیم زمانے میں تو یہ ایک اشکال کی چیز تھی، لوگ سوال کرتے تھے کہ اعمال کا اپنا کوئی جسم نہیں ہے، پھر ان کو ترازو کے پلڑے میں رکھ کر کیسے تولا جائے گا؟ یہ اُس زمانے کی بات ہے۔ اب تو سائنس کی ترقیوں کے نتیجے میں ایسی ایسی چیزیں ناپی اور تولی جاتی ہیں جن کا کوئی جسم نہیں ہے۔ اُس زمانے میں لوگ یوں سمجھتے تھے کہ جسم والی چیز ہی کو تولا اور ناپا جا سکتا ہے، بغیر جسم والی چیز میں یہ صورت ممکن نہیں ہے۔ لیکن اب تو حرارت و برودت کو ناپا جاتا ہے۔ گرمی اور سردی کو ناپا جاتا ہے۔ آدمی کے بخار کو بھی ناپا جاتا ہے، آواز کو ناپا جاتا ہے۔ خون کا دباؤ (پریشر)، خون کا شوگر، خون کا کالیسٹرول ناپا جاتا ہے۔ اسی طرح ہر وہ چیز ناپی جاتی ہے جس کا کوئی جسم نہیں ہے۔ جب انسان اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی اپنی محدود عقل اور محدود طاقت وقدرت کے ذریعے ایسے آلات بنا سکتا

ہے، جن سے ان چیزوں کو ناپا اور تولا جا سکتا ہے، تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے تو پوری کائنات کو پیدا کیا، انسانوں کو پیدا کیا اور انسان کے اعمال کو بھی پیدا کیا۔ کیا وہ اس بات کی قدرت نہیں رکھتا کہ وہ انسانوں کے اعمال کو تولے؟ اللہ تعالیٰ قیامت کے روز باقاعدہ ترازو قائم کریں گے، اور لوگوں کے سامنے یہ سلسلہ ہوگا، اور ان ترازوؤں کے ذریعے فیصلہ ہوگا۔

ترازو کیوں قائم کریں گے......؟؟؟

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے جو قدیم زمانے میں بعض گمراہ فرقوں نے قائم کیا تھا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ تو سب جانتے ہیں، تو پھر اللہ کو ترازوئیں لگا کر اعمال تولنے کی کیوں ضرورت پیش آئی؟ اللہ تبارک وتعالیٰ اپنے علم کی بنیاد پر فیصلہ کر سکتے تھے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اللہ کو سب کچھ معلوم ہے کہ کس کے اعمال وزنی ہیں اور کس کے اعمال ہلکے ہیں؛ لیکن قیامت کے روز اللہ تبارک وتعالیٰ میدان محشر میں جو فیصلے کریں گے، وہ اس انداز سے کریں گے کہ لوگوں کو انصاف ہوتا ہوا نظر آئے گا۔ یہ دیکھ کر ہر آدمی اپنے متعلق خود فیصلہ کر لے گا، اس کو کچھ کہنا نہیں پڑے گا، وہ اپنے مجرم ہونے کو خود ہی محسوس کر لے گا کہ میرے اعمال وزنی ہیں یا ہلکے ہیں؟ گویا اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے متعلق جو فیصلہ کیا جا رہا ہے اس کے متعلق وہاں کھل کر ایسی صورتیں پیدا کی جائیں گی کہ انسان کو خود اس فیصلے کا اقرار کرنا پڑے گا، گویا انصاف ہوتا ہوا نظر آئے گا۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ یہ ترازوئیں قائم کریں گے۔ ورنہ اللہ تعالیٰ اپنے طور پر فیصلہ کر لیں، وہ جانتے ہیں کس کے اعمال میں کتنا وزن ہے؟ کوئی اشکال کی چیز نہیں تھی؛ لیکن قیامت کے روز باقاعدہ گواہ پیش کیے جائیں گے، وہ گواہی دیں گے، اور فیصلہ ہوگا۔

عمل کا وزن دیکھیں:

جس طرح دنیا کی عدالتوں میں مجرم کے خلاف گواہ پیش کیے جاتے ہیں۔ خود جج یا قاضی کو کسی آدمی کا مجرم ہونا معلوم ہو تب بھی باقاعدہ کیس اور مقدمے کی کارروائی ہوتی ہے، گواہ پیش ہوتے ہیں، گواہی دیتے ہیں، ان کی گواہی کے بعد اس گواہی کی بنیاد پر فیصلہ کیا جاتا ہے؛ تاکہ مجرم کو بھی اپنا مجرم ہونا معلوم ہو جائے۔ تو قیامت کے روز گواہیاں بھی لی جائیں گی، اعمال کو تولا جائے گا، اس کے بعد اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے فیصلہ کیا جائے گا اس لیے اپنے اعمال میں وزن پیدا کرنے کا اہتمام کریں۔ ہم یہ نہ دیکھیں کہ کتنا عمل کیا؟ گنتی نہ کریں۔ بلکہ اس عمل میں وزن ہے یا نہیں؟ یہ ہمیں دیکھنا ہے۔

وزن کیسے پیدا ہو......؟؟؟:

اب وہ کون سی چیزیں ہیں جن سے عمل میں وزن پیدا ہوتا ہے؟ تو تین چیزیں ایسی ہیں جن سے عمل میں وزن پیدا ہوتا ہے: (۱) ایمان۔ (۲) صدق: یعنی سنت وشریعت کے مطابق ہونا۔ (۳) اخلاص۔

(۱) ایمان:

ایمان کی وجہ سے اعمال میں وزن پیدا ہوتا ہے۔ دنیا میں کافر بھی بہت سے اچھے اچھے کام کرتے ہیں۔ بھوکوں کو کھانا کھلاتے ہیں، پیاسوں کو پانی پلاتے ہیں، ننگوں کو کپڑا پہناتے ہیں، بیماروں کے علاج کا انتظام کرتے ہیں، بڑے بڑے ہسپتال قائم کرتے ہیں وہاں مفت علاج ہوتا ہے، کسی سے ایک پیسہ بھی نہیں لیا جاتا۔ کوئی قدرتی مصیبت، آفت آتی ہے تو بڑے بڑے رفاہی کام بھی کرتے ہیں۔ یہ سارے اچھے اچھے اعمال ہیں؛ لیکن کفر کی

وجہ سے ان کے ان سارے اعمال میں قیامت کے روز کوئی وزن نہیں ہوگا۔ اتنا ضرور ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ ان کے ان اچھے اعمال کا بدلہ نیک نامی کی شکل میں، روزی میں زیادتی کی شکل میں اور دوسری شکلوں میں دنیا ہی میں عطا فرمائیں گے؛ لیکن آخرت میں ان کے عمل کا کوئی وزن نہیں ہوگا۔ چناں چہ قرآن پاک میں باری تعالیٰ نے اس چیز کو بتلایا ہے: وَقَدِمْنَآ اِلٰى مَا عَمِلُوْا مِنْ عَمَلٍ فَجَعَلْنٰهُ هَبَآءً مَّنْثُوْرًا.(الفرقان:۲۳) (قیامت کے روز ہم کفار کے اعمال کی طرف ان کا فیصلہ کرنے کی طرف متوجہ ہوں گے تو ان کے اعمال کو ہم ہوا میں اڑتے ہوئے ذرات کی طرح بنا دیں گے) یعنی ان میں کوئی وزن نہیں ہوگا، جیسے ہوا میں اڑنے والے ذرات کا کوئی وزن نہیں ہوتا ایسے ہی کافروں کے اعمال کا کوئی وزن نہیں ہوگا۔ کیوں کہ ایمان نہیں تھا۔

ایمان کے بغیر وزن نہیں:

اسی طرح سورۂ کہف میں باری تعالیٰ کا ارشاد ہے: قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْاَخْسَرِيْنَ اَعْمَالًا۔ اَلَّذِيْنَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ هُمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ يُحْسِنُوْنَ صُنْعًا۔ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ وَ لِقَآئِهٖ فَحَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فَلَا نُقِيْمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَزْنًا. (الکھف:۱۰۵) (اے نبی! آپ کہہ دیجیے! میں تم کو بتلاؤں وہ لوگ جو اپنے اعمال میں گھاٹے اور نقصان میں ہیں؟ جن کی کوششیں دنیا کی زندگی میں بے کار اور اکارت گئیں؛ اور وہ یوں سمجھتے ہیں کہ وہ کوئی اچھا کام کر رہے ہیں۔ (وہ کون ہیں؟) جنھوں نے اللہ تبارک وتعالیٰ کی آیات کو جھٹلایا، اس کی ملاقات کو بھی جھٹلایا۔ ہم قیامت کے دن ان کے لیے کوئی وزن قائم نہیں کریں گے) تو اعمال میں وزن کے لیے پہلی شرط ایمان ہے۔ ایمان کے بغیر اعمال میں

وزن پیدا نہیں ہوگا۔

(۲) صدق:

اعمال میں وزن پیدا کرنے کے لیے دوسری شرط صدق ہے۔صدق کا مطلب یہ ہے کہ جو بھی عمل کیا جائے سنت اور شریعت کے مطابق ہو۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عمل کرنے کا جو طریقہ بتلایا ہے، اگر اس کے مطابق عمل کو انجام دیا جائے گا تب تو اس میں وزن ہوگا، اللہ تعالیٰ کے ہاں وہ قبولیت حاصل کرے گا۔ ورنہ ظاہری اعتبار سے کوئی کتنا ہی اچھا کام کر رہا ہو؛ لیکن وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے طریقے کے مطابق نہیں ہے تو اس کے عمل میں وزن نہیں ہوگا۔

اس کو مثال سے یوں سمجھیے کہ ایک آدمی نماز پڑھ رہا ہے- نماز کتنا اچھا عمل ہے!!! نماز کو حدیث شریف میں دین کا ستون قرار دیا گیا، اور دین میں نماز کی بہت اہمیت بیان کی گئی- اللہ ہی کے لیے نماز پڑھ رہا ہے؛ لیکن نماز کا جو طریقہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بتلایا اس کے مطابق نماز نہیں پڑھتا۔ فجر کی نماز دو کے بجائے چار رکعت پڑھی کہ ڈبل پڑھوں، ارے بھائی! تو ڈبل پڑھے گا تو وہ دو رکعت پر جو ثواب ملتا ہے وہ بھی نہیں ملے گا۔ تو ہمیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے طریقے کے مطابق ہر عمل کرنا ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرات صحابہؓ کو طریقہ بتلا کر باقاعدہ ہدایت فرمائی: صلوا كما رأيتموني أصلي. (مجھے جس طرح نماز پڑھتا ہوا دیکھو، اس کے مطابق نماز پڑھو)[۱] اگر ہماری نماز اس طریقے کے مطابق نہیں ہے تو ہماری نماز میں کوئی وزن نہیں ہوگا۔

---

(۱) مسند الشافعي: ۲۹۴ (ط: شركة غراس، الكويت) وصحيح ابن حبان: ۱۶۵۸ (ط: مؤسسة الرسالة، بيروت) وسنن الدار قطني: ۱۰۶۹ (ط: مؤسسة الرسالة، بيروت) والسنن الكبرىٰ للبيهقي: ۳۸۵۵ و۳۸۵۶ (ط: دار الكتب العلمية، بيروت).

تعدیلِ ارکان:

حدیث شریف میں آتا ہے کہ ایک مرتبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مسجد میں تشریف فرما ہیں، ایک دیہاتی صحابیؓ آئے اور دو رکعت ادا کی۔ پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آئے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بیٹھے ہوئے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو سلام کیا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: وعليك السلام ارجع فصل فإنك لم تصل. (واپس جاؤ! نماز پڑھو، اس لیے کہ تم نے نماز نہیں پڑھی) پھر گئے، پھر نماز پڑھی، پھر آکر سلام کیا۔ پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسی طرح فرمایا۔ تیسری مرتبہ بھی ایسا ہوا تو آخر میں ان صحابیؓ نے عرض کیا: اس ذات کی قسم! جس نے آپ کو رسول بنا کر بھیجا ہے آپ بتلائیے کہ میں کس طرح نماز پڑھوں؟ پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بتلایا: پہلے تکبیر کہہ کر نماز شروع کرو، اور قیام اطمینان اور سکون کے ساتھ کرو، قراءت کرو۔ پھر رکوع میں جاؤ، اطمینان اور سکون کے ساتھ رکوع کرو۔ پھر رکوع سے اٹھو، اطمینان اور سکون سے قومہ کرو، اس کے بعد سجدہ میں جاؤ، سجدہ بھی اطمینان اور سکون کے ساتھ کرو۔ پھر اٹھو، اور جلسہ- دو سجدوں کے درمیان بیٹھنا- بھی اطمینان سے کرو، پھر دوسرا سجدہ کرو۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پورا طریقہ بتلایا۔[۱] جس کو فقہا تعدیل ارکان سے تعبیر کرتے ہیں۔ یعنی نماز کے ہر رکن کو قیام، رکوع، قومہ، جلسہ سجدہ ہر ایک کو اطمینان اور سکون کے ساتھ ادا کیا جائے۔ اگر اس طرح ادا نہیں کیا جائے گا تو یہ نماز درست نہیں ہوگی۔

---

(۱) مسند أحمد: ۹۶۳۵ و ۱۸۹۹۷ وصحيح البخاري: ۷۵۷ و ۷۹۳ و ۶۲۵۱ و ۶۶۶۷ وسنن أبي داود: ۸۵۶ وسنن الترمذي: ۳۰۳ و ۲۶۹۲ وغيرها.

بدعت وزن سے خالی:

اسی طرح بہت سے اعمال ظاہر میں اچھے معلوم ہوتے ہیں؛ لیکن نبی کریم ﷺ نے یا قرآن نے اس کا حکم نہیں دیا، جس کو بدعت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ہمارے معاشرے میں بہت سے ایسے اعمال رواج پا گئے ہیں، جیسے کسی کی موت کے بعد تیسرے دن باقاعدہ دعوت کی جاتی ہے، لوگ جمع ہوتے ہیں، قرآن پڑھتے ہیں، ایصال ثواب کرتے ہیں، کھانا کھلایا جاتا ہے۔ دیکھنے میں تو بہت اچھا معلوم ہوتا ہے؛ لیکن اپنے لیے انہوں نے جن چیزوں کو لازم قرار دے دیا یعنی وقت مقرر کر دیا وغیرہ، یہ ساری چیزیں شریعت کے بتلائے ہوئے طریقے کے مطابق نہیں ہیں۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: من أحدث في أمرنا هذا ماليس فيه فهو ردٌّ. (ہمارے اس دین میں جنہوں نے کسی نئی بات کو ایجاد کیا وہ اس پر واپس کر دی جائے گی)[1] مردود ہے، لوٹا دی جائے گی۔ كل محدثة بدعة و كل بدعة ضلالة و كل ضلالة في النار. (ہر نئی چیز بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے اور ہر گمراہی جہنم میں جائے گی)[2] تو بہت سے اعمال جو ہمارے معاشرے میں ہوتے ہیں جیسے: تیجہ، دسواں، چالیسا اس طرح کے اعمال بظاہر دیکھنے میں اچھے معلوم ہوتے ہیں؛ لیکن چوں کہ نبی کریم ﷺ کے طریقے سے ہٹ کر ہیں، ان میں صدق والی صفت نہیں پائی جاتی، اس لیے ان پر کوئی ثواب نہیں ملے گا اور ان اعمال کا کوئی وزن نہیں ہوگا۔ بدعت وزن سے خالی ہے۔

---

(۱) مسند أحمد: ۲۶۰۳۳، ۲۶۳۲۹ وصحيح البخاري: ۲۶۹۷ وصحيح مسلم: ۱۷ [۱۷۱۸] وسنن أبي داود: ۴۶۰۶ وسنن ابن ماجه: ۱۴.

(۲) مسند أحمد: ۱۷۱۴۴، ۱۷۱۴۵ وسنن أبي داود: ۴۶۰۷، ۴۶۰۸ و البدع لابن وضاح القرطبي: ۵۶، ۵۷ و السنة لابن أبي عاصم: ۲۵.

کھانا تو ہمیں بھیجنا چاہیے:

دیکھو! اس موقع پر کھانا کھلاتے ہیں۔ جب کہ میت ہوئی ہے اور وہ لوگ کھانا کھلاتے ہیں۔ حالاں کہ غزوۂ موتہ کے موقع پر جب نبی کریم ﷺ کے پاس حضرت جعفرؓ کی موت کی خبر آئی تو حضور ﷺ نے ہدایت کی کہ ان کے گھر والوں کے لیے کھانا بناؤ، کیوں کہ وہ غم میں مشغول ہیں۔[1] تو کھانا تو ہمیں بھیجنا چاہیے، اس کے بجائے لوگ میت کے گھر جا کر کھانا کھاتے ہیں!!!

سنت و بدعت، عالم امثال میں:

ہمارے بزرگوں میں ایک بزرگ حضرت شاہ یاسین صاحب نگینویؒ گزرے ہیں۔ جو حضرت گنگوہیؒ کے خلفاء میں سے ہیں۔ حضرت شیخؒ نے فضائل اعمال کے مقدمے میں ان کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ ان کے ایک خلیفہ تھے شاہ عبدالعزیز صاحب دعاجو۔ حضرت شیخؒ نے فضائل دُرود کے مقدمے میں ان کا تذکرہ کیا ہے۔ انہوں نے فضائل کی کتابوں کی تالیف کے سلسلے میں حضرت شیخؒ سے فرمایا تھا، حکایات صحابہؓ کو حضرت شیخؒ نے ان ہی کی تاکید پر تالیف فرمایا تھا۔ انہوں نے درود کے متعلق بھی تاکید فرمائی تھی؛ لیکن اس کی نوبت نہیں آئی تھی، تو اپنے خلیفہ شاہ عبدالعزیز صاحب دعاجوؒ کو وصیت کی تھی کہ حضرت شیخؒ سے بار بار کہیں۔ چناں چہ حضرت شیخؒ نے فضائل درود کے مقدمے میں تذکرہ کیا ہے کہ انہوں نے یاد دہانی کروائی، پھر حضرت شیخؒ نے فضائل درود تالیف فرمائی۔ تو حضرت شاہ عبدالعزیز

---

(۱) مسند أحمد: ۱۷۵۱ وسنن أبي داود: ۳۱۳۲ وسنن ابن ماجه: ۱۶۱۰ وسنن الدار قطني: ۱۸۵۰، ۱۸۴۹ والمستدرك للحاكم: ۱۳۷۷.

صاحب دعاجوؒ کے متعلق مفتی محمد تقی صاحب فرماتے ہیں کہ وہ دعوت وتبلیغ کے بزرگوں میں سے تھے۔ایک مرتبہ کراچی میں مفتی محمد شفیع صاحبؒ کے پاس حاضر ہوئے اور کہا کہ حضرت میں نے ایک خواب دیکھا ہے۔حضرت نے پوچھا کہ کیا خواب دیکھا؟ تو انہوں نے عرض کیا کہ: ایک تختۂ سیاہ (بلیک بورڈ) ہے، آپ کھڑے ہیں، پہلے آپ نے اس پر ایک کا عدد (۱) لکھا، پھر اس کی دائیں طرف صفر لگایا (۱۰)، پھر پوچھا: یہ کیا ہے؟ کہنے لگے: یہ دس ہے۔پھر دوسرا لگایا (۱۰۰)، پھر کہا: یہ کیا ہے؟ سب نے کہا: یہ سو (۱۰۰) ہے۔پھر تیسرا لگایا (۱۰۰۰)، کہا: یہ کیا ہے؟ تو سب نے کہا: یہ ہزار (۱۰۰۰) ہے۔ چوتھا لگایا کہ یہ دس ہزار (۱۰۰۰۰) ہیں۔اب ظاہر ہے کہ جتنے بھی صفر بڑھاتے جائیں گے اتنی ہی اس کی قیمت میں دس دس گنا اضافہ ہوتا جائے گا۔اس کے بعد اس کو مٹا کر پھر ایک (۱) لکھا، اور اس کی بائیں طرف صفر (۰۱) لگایا، اور پوچھا: یہ کیا ہے؟ کہا کہ یہ صفر اعشاریہ ایک یعنی یہ دسواں حصہ ہے۔پھر دوسرا صفر لگایا (۰۰۱)، اور کہا یہ صفر صفر اعشاریہ ایک ہے یعنی یہ سوواں حصہ ہے۔پھر تیسرا صفر (۰۰۰۱) لگایا کہ یہ کیا ہے؟ کہا کہ صفر صفر صفر اعشاریہ ایک یعنی ہزار (۱۰۰۰) واں حصہ ہے۔تو بائیں طرف جتنے بھی صفر لگاتے جاؤ گے، قیمت اتنی ہی کم ہوتی جائے گی۔دائیں طرف جتنے لگاتے جاؤ گے اتنی قیمت بڑھتی جائے گی۔فرمایا سنت کی مثال ایسی ہے جیسے دائیں طرف صفر لگ رہے ہیں، اور بدعت کی مثال ایسی ہے جیسے بائیں طرف صفر لگ رہے ہیں۔مفتی محمد تقی صاحب اپنے بہت سے مواعظ میں اس کو بدعت کی مثال میں پیش کرتے ہیں۔حقیقت یہ ہے کہ بدعت والا عمل ظاہری اور دیکھنے کے اعتبار سے کتنا ہی اچھا عمل کیوں نہ ہو؛ لیکن اس کے اوپر اللہ تعالیٰ کے ہاں اجر وثواب نہیں ہے، اس میں وزن نہیں ہوتا۔وزن تو سنت وشریعت کی ہدایت کے مطابق عمل کرنے پر ہوتا ہے۔تو اعمال میں وزن پیدا

کرنے کے لیے دوسری شرط صدق یعنی اس عمل کا سنت وشریعت کے مطابق ہونا ہے۔

(۳) اخلاص:

اعمال میں وزن پیدا ہونے کے لیے تیسری شرط اخلاص ہے۔ یعنی وہ عمل اللہ کے واسطے اور اس کو راضی کرنے کے لیے کیا جائے۔ لوگوں کو دکھلانے کے لیے کہ ہماری بڑائی ہوگی، لوگ ہمیں اچھا سمجھیں گے اور شہرت وریا کاری کے لیے نہ ہو؛ بلکہ اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے ہو تو اس عمل میں وزن ہوگا۔ مان لو کہ ایک آدمی نوافل نہیں پڑھتا، فرائض، واجبات اور سنن مؤکدہ پر اکتفا کرتا ہے؛ لیکن وہ سب خالص اللہ کی رضا وخوشنودی حاصل کرنے کے لیے کرتا ہے، تو چاہے اس نے نوافل کا اہتمام نہ کیا ہو، اس کے اعمال میں وزن ہوگا۔ اور اس کے برخلاف کوئی دوسرا آدمی، جو خوب نوافل پڑھتا ہے؛ لیکن دل میں یہ ہے کہ لوگ مجھے اچھا سمجھیں، شہرت اور نام آوری کے لیے کر رہا ہے، تو اس کے اعمال میں کوئی وزن نہیں ہوگا۔ الغرض جو عمل خالص اللہ کو راضی کرنے کے لیے اور اخلاص کے ساتھ کیا جائے، چاہے چھوٹا عمل ہو تب بھی اس میں وزن ہوگا۔

کتے کو پانی پلانے پر مغفرت:

بخاری شریف میں ہے کہ ایک مرتبہ ایک آدمی جنگل سے گزر رہا تھا، اس کو پیاس لگی، اس نے وہاں ایک کنواں دیکھا؛ لیکن وہاں رسی ڈول نہیں تھی، کچا کنواں تھا، اس کی دیواروں میں خانے بنے ہوئے تھے، وہ نیچے اترا، اور پانی پی کر اپنی پیاس بجھائی۔ پھر جب باہر آیا تو دیکھا کہ وہاں ایک کتا گیلی مٹی چاٹ رہا ہے۔ اس نے محسوس کیا کہ میں پیاس کی شدت بھگت چکا ہوں اور کتا بھی اسی شدت سے دوچار ہے، اس نے سوچا کہ میں اس کو پانی

پلاؤں۔ ڈول رسی تو تھی نہیں، البتہ اس کے پاؤں میں چمڑے کے موزے تھے، اس نے وہ نکالے اور پھر کنویں میں جا کر موزے میں پانی بھرا، اور موزوں کو دانتوں سے دبایا۔ کیوں کہ ہاتھ اور پاؤں تو اوپر چڑھنے کے لیے استعمال کرنے تھے۔ خیر! اس نے باہر آ کر کتے کو پانی پلایا۔ تو حدیث شریف میں ہے: فشكر الله له وغفر له. (اللہ تعالیٰ نے اس آدمی کے اس عمل کی قدر فرمائی، اور اس کی مغفرت کا فیصلہ فرما دیا)[۱] یہ دیکھنے کے اعتبار سے تو بہت چھوٹا عمل ہے کہ پانی پلایا، وہ بھی جانور کو، اور وہ جانور بھی ایک کتا، جس کو لوگ دھتکارتے ہیں، اپنے پاس نہیں آنے دیتے؛ لیکن اس نے نیک عمل خالص اللہ کے واسطے کیا تھا، تو اللہ کے ہاں اس کی قدر یہ ہوئی کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی مغفرت فرمائی، اور اس کے لیے جنت کا فیصلہ کر دیا۔ کیوں؟ اس لیے کہ یہاں اخلاص تھا، کوئی دیکھنے والا نہیں تھا۔ ظاہر ہے وہاں کے جو حالات تھے وہ اس بات کے متقاضی تھے کہ اس نے یہ عمل خالص اللہ کے لیے کیا ہے۔ تو جو عمل اللہ کے لیے ہو، چاہے چھوٹے سے چھوٹا عمل ہو، لیکن اللہ کے ہاں اس کی بڑی قدر ہے۔ نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں: لاتحقرنّ من المعروف شيئاً. (نیکی کے کسی بھی کام کو حقیر مت سمجھو)[۲] بس! خالص اللہ کے لیے ہونا چاہیے۔ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے:

الإيمان بضع و سبعون شعبةً أفضلها لا إله إلا الله و أدناها إماطة الأذى عن الطريق.

(ایمان کی ستر (۷۰) سے زیادہ شاخیں ہیں، ان میں سب سے اعلیٰ شاخ کلمۂ لا إله إلا الله

---

(۱) صحيح البخاري: ۱۷۳، ۲۵۲، ۲۳۶۳، ۲۴۶۶، ۲۴۷۲، ۶۰۰۹.

(۲) مسند ابن الجعد: ۳۱۰۰ و مسند أحمد: ۱۵۹۵۵، ۲۰۶۳۳، ۲۰۶۳۵، ۲۱۵۱۹ وصحيح مسلم: ۱۴۴ [۲۶۲۶] مسند البزار: ۳۹۶۲ و المعجم الكبير للطبراني: ۶۳۸۳، ۶۳۸۵، ۶۳۸۸.

ہے، اور سب سے ادنیٰ راستے سے کسی تکلیف دینے والی چیز کو ہٹانا ہے)[1] راستے میں کانٹا، پتھر، کیلے کا چھلکا وغیرہ چیزیں پڑی ہیں، آپ نے دیکھا کہ کسی کا پاؤں اوپر پڑے گا تو پھسل کر گر جائے گا، آپ نے چپکے سے اس کو کنارے کر دیا۔ تو عمل چھوٹا سا ہے؛ لیکن اگر خالص اللہ تعالیٰ کے لیے کیا ہے تو اللہ تعالیٰ کے ہاں اس کی بڑی قدر ہے۔

ٹہنی ہٹانے پر جنت کا فیصلہ:

بخاری شریف میں ایک اور قصہ ہے کہ ایک آدمی گزر رہا تھا، راستے میں ایک خاردار ٹہنی تھی، جو گزرنے والوں کے لیے رکاوٹ کا سبب تھی، اس نے وہاں سے وہ ٹہنی ہٹا دی، تاکہ اللہ کے بندوں کو تکلیف نہ ہو۔ اس بات پر اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے جنت کا فیصلہ فرما دیا۔[2]

نیکی نیکی کو کھینچتی ہے:

تو نیکی کا عمل دیکھنے میں چاہے چھوٹا سا ہی کیوں نہ ہو، خالص اللہ کے لیے ہو تو بڑا وزنی ہے۔ اور یہی نیکی دوسری نیکی کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔ نیکی کی خاصیت ہے کہ آپ نے اگر خالص اللہ تعالیٰ کے لیے کوئی عمل انجام دیا ہے تو اس کی برکت یہ ہوگی کہ آپ کو اللہ تعالیٰ دوسری نیکی کی توفیق عطا فرمائیں گے۔

---

(۱) مسند أبي داود الطیالسي: ۲۵۲۴ و الأدب المفرد: ۵۹۸ و سنن الترمذي: ۲۶۱۴ و سنن ابن ماجه: ۵۷ و تعظیم قدر الصلاۃ للمروزي: ۴۹۸ و مکارم الأخلاق للخرائطي: ۳۰۳ و صحیح ابن حبان: ۱۹۰، ۱۹۱ وغیرھا.

(۲) صحیح البخاري: ۶۵۲، ۲۴۷۲.

واردِ روحانی کی کروقدردانی:

جب دل میں نیک کام کرنے کا ارادہ اور خیال آئے، تو اس کو حضرات صوفیاء فرماتے ہیں کہ یہ واردِ روحانی ہے۔یعنی نیک کام کرنے کا خیال اللہ نے دل میں ڈالا ہے، تواب آپ اس کی قدر کر لیجیے، یہ اللہ کا بھیجا ہوا مہمان ہے۔اس خیال آنے پر فوراً وہ کام کر لو۔اگرآپ اس کی طرف توجہ نہیں کریں گے......تو جیسے کوئی شریف آدمی آپ کے گھر مہمان آیا، دروازہ کھٹکھٹایا، گھنٹی بجائی؛لیکن آپ نے دیکھنے کے باوجود دروازہ نہیں کھولا، تو واپس چلا جائے گا۔شریف آدمی غیرت مند ہوتا ہے۔اسی طرح نیک کام کرنے کا دل میں خیال پیدا ہونا یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھیجا ہوا ایک مہمان ہے، اس کی قدر یہ ہے کہ فوراً اس پر عمل کیا جائے۔عمل کریں گے تو اس کی برکت سے اللہ تعالیٰ دیگر نیک اعمال کی توفیق دیں گے۔

ہمیں بھی کرنا چاہیے:

حاصل یہ ہے کہ عمل میں وزن تین چیزوں سے آتا ہے: ایمان، صدق (یعنی سنت و شریعت کے مطابق ہونا) اور اخلاص۔ہمیں بھی اپنے اعمال کو وزنی بنانے کے لیے ان تین چیزوں کا اہتمام کرنا چاہیے۔نفس اور شیطان ہمارے اعمال کو خراب کرنے کے لیے اسی میں رکاوٹ ڈالتے ہیں۔عموماً شہرت وریاکاری کا خیال آتا ہے، اور آدمی اپنے عمل کے ثواب سے محروم ہو جاتا ہے۔

اللہ ہم سب کو توفیق عطا فرمائے۔